WWW.PAKSOCIETY.COM
تعلیم و تربیت
آمدِ رمضان
مبارک ہو!
جون 2015
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

جون 2015ء
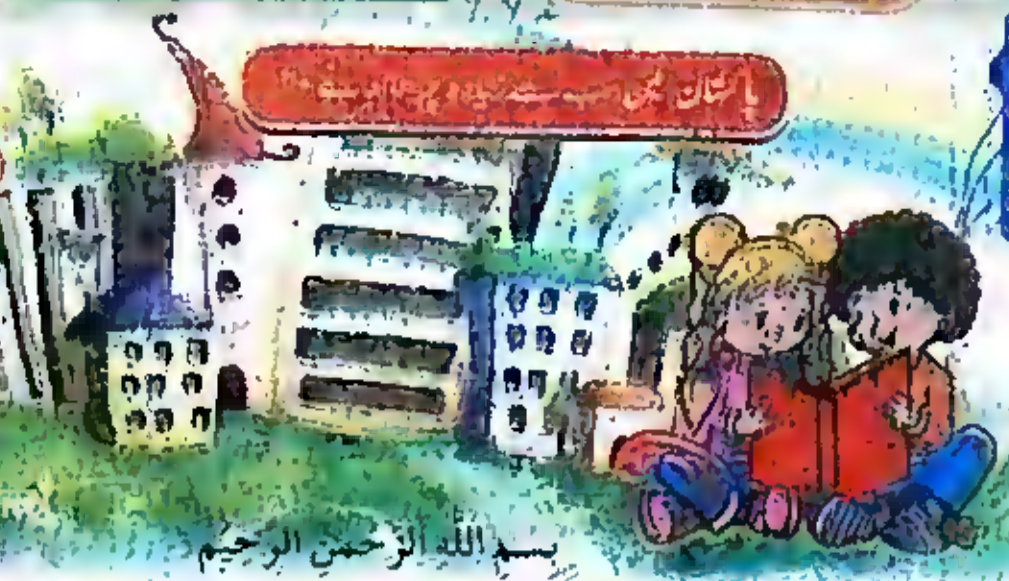
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

شیخ سعدی شیرازیؒ جو فارسی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے، حصولِ علم کے لیے شیراز سے بغداد کا سفر کرنا پڑا۔ اس زمانے میں موٹر کاریں، ریل گاڑی یا ہوائی جہاز نہیں ہوتے تھے بلکہ لوگ نقل و حرکت کے لیے اونٹ، گھوڑے اور ہاتھی وغیرہ کا استعمال کرتے تھے یا جن لوگوں کی ایسی استطاعت نہ ہوتی تھی یعنی جو لوگ غریب ہوتے تھے، وہ پیدل ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کیا کرتے تھے۔ شیخ سعدی شیرازیؒ کے پاس سفر کے لیے کوئی جانور دستیاب نہ تھا، لہٰذا وہ پیدل ہی بغداد جا رہے تھے۔ بغداد، شیراز سے کافی فاصلے پر تھا اور شیخ سعدی شیرازیؒ پیدل ہی سفر طے کر رہے تھے۔ اتنا لمبا سفر پیدل چلنے پر ان کا جوتا گھس کر ٹوٹ گیا اور ایسی شکل اختیار کر گیا کہ اس کو پاؤں میں پہننا ناممکن ہو گیا۔ ابھی سفر بہت باقی تھا، لہٰذا انہوں نے ننگے پاؤں چلنا شروع کر دیا۔ اس طرح ننگے پاؤں چلتے چلتے ان کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ ننگے پاؤں پیدل چلنے سے ان کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ پھر چلنے سے وہ چھالے پھٹنے لگے اور درد سے تکلیف بڑھنے لگی، یہاں تک کہ وہ تکلیف کی شدت سے کراہنے لگے۔ اب شیخ سعدی شیرازیؒ کے لیے پیدل چلنا مشکل ہو گیا اور وہ تھک کر ایک جگہ بیٹھ گئے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے شکوہ کرنے لگے کہ اے اللہ! اگر تم نے مجھے دولت سے نوازا ہوتا تو میں یوں پیدل سفر نہ کرتا۔ نہ میرا جوتا ٹوٹتا، نہ میرے پاؤں زخمی ہوتے اور نہ ہی مجھے اس تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا۔

ابھی شیخ سعدی شیرازیؒ بیٹھے ہوئے یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ان کی نگاہ کچھ فاصلے پر ایک معذور شخص پر پڑی جس کے سرے سے دونوں پاؤں نہ تھے۔ وہ کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے دھڑ کی مدد سے زمین پر بیٹھ کر خود کو گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ جب شیخ سعدی شیرازیؒ نے یہ منظر دیکھا تو ان کے دل میں خیال آیا کہ میرے دونوں پاؤں سلامت ہیں، میں کھڑا بھی ہو سکتا ہوں اور چل بھی سکتا ہوں۔ انہوں نے فوراً اللہ تعالیٰ سے اپنی شکایت کی معافی مانگی اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ انہوں نے سوچا کہ کیا ہوا میرے پاس اگر دولت نہیں، جوتے نہیں یا سواری کا جانور نہیں لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے اس معذور شخص سے بہتر بنایا ہے، لہٰذا مجھے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے۔ اس سوچ کے بعد شیخ سعدی شیرازیؒ نے دوبارہ اپنے سفر کا آغاز کر دیا۔

پیارے بچو! ہمیں ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اگر کسی مصلحت کے تحت وقتی طور پر کوئی مصیبت، پریشانی یا مشکل پیش آ جائے تو اللہ تعالیٰ سے اس کا شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ آپ نے دیکھا کہ شیخ سعدی شیرازیؒ کو کس طرح اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

پیارے بچو! اس مہینے کے درمیان میں رمضان المبارک کا مہینہ شروع ہو جائے گا۔ آپ سب کو رمضان مبارک ہو اور اللہ تعالیٰ آپ کو رمضان کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے۔ آمین!

رمضان کے حوالے سے ایک مضمون "بہارِ رمضان" بھی شاملِ اشاعت ہے۔

جون کا مہینہ شدید گرمی کا ہے، لہٰذا دھوپ میں نکلتے وقت احتیاط کیجیے۔ دھوپ میں سر کو ڈھانپ کر رکھیں، کھانے پینے میں احتیاط کریں۔ اس کے علاوہ اسکول میں گرمیوں کی چھٹیاں بھی ہو چکی ہوں گی۔ اپنا ہوم ورک اور پڑھائی خوب دل لگا کر کریں۔ فضول کھیل کود میں وقت ضائع نہ کریں۔

اپنی دعاؤں اور نیک تمناؤں میں یاد رکھیے گا۔ اب اجازت!

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

خط و کتابت کا پتا

ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہِ قائدِ اعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بذریعہ بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 850 روپے۔
مشرقِ وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرقِ بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 30 روپے

حمد باری تعالیٰ

خدایا نہیں، کوئی تیرے سوا
اگر تو نہ ہوتا تو ہوتا ہی کیا

تصور تری ذات کا ہے محال
کسے یہ سکت اور کہاں یہ مجال

تفکر کے جلتے ہیں پر اس جگہ
تصور کا کتنا ہے سر اس جگہ

نہ ٹھہری کوئی ناؤ اس موج میں
نہ پہنچا کوئی تیر اس اوج میں

جلا اس ہوا میں نہ کوئی چراغ
پریشاں ہوئے دل تھکے سب دماغ

جو ہوتی مشابہ ترے کوئی چیز
تو کچھ کام کرتی سمجھ یا تمیز

ترا کوئی ہم جنس و ہمتا نہیں
گماں کا یہاں پاؤں جمتا نہیں

سمجھ کیا ہے اور کیا سمجھ کی بساط
سمندر سے قطرے کا کیا ارتباط

چلی بوند لینے سمندر کی تھاہ
کیا موج نے لیکن اس کو تباہ

ہوئی آپ ہی گم تو پائے کسے؟
بتائے وہ کیا اور جتائے کسے؟

آپ ﷺ نے فرمایا

دو جگ کے سرکار محمدؐ
نبیوں کے سردار محمدؐ

اُمت کے غم خوار محمدؐ
ہر اک کے دل دار محمدؐ

حکم خدا لے آئے محمدؐ
حق کا سندیسہ لائے محمدؐ

رحمت بن کر آئے محمدؐ
سارے جہاں پر چھائے محمدؐ

اک سچے فرمان کو لائے
تعلیم قرآن کو لائے

مسلم کی اک آن کو لائے
نئی نویلی شان کو لائے

سب سے افضل اُمت ان کی
عرش و زمین پر عظمت ان کی

عام ہے سب پر رحمت ان کی
سب پر لازم اُلفت ان کی

بن کر آئے حق کے پیامی
سب سے اعلیٰ سب سے گرامی

حق کے فرشتے ان کے سلامی
شاہوں نے کی ان کی غلامی

اوج: عروج — بساط: ہمت
تھاہ: گہرائی — ارتباط: تعلق، محبت

روزہ کا ثواب ضائع نہ کیجیے!

محمد طیب الیاس

پیارے بچو! اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔ گنتی کے چند دن روزے رکھنے ہیں۔'' (البقرۃ:4-183)

رمضان شریف کے روزے ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں 2ھ میں فرض ہوئے۔ جس طرح نماز اور زکوٰۃ پہلی اُمتوں پر فرض تھی اسی طرح ان پر روزے بھی فرض تھے۔ پہلی اُمتوں نے بھی روزے رکھے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں بھی روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے۔ سال کے بارہ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ یعنی رمضان المبارک میں روزے فرض کیے گئے ہیں۔ اسلامی سال کے 354 یا 355 دن ہوتے ہیں، تو ان میں سے صرف 29 یا 30 دن روزے فرض ہیں۔ رمضان کے روزے رکھنا ہر عاقل بالغ مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

روزہ کی حکمت اور فائدہ بتاتے ہوئے فرمایا: ''تاکہ تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہو۔'' تقویٰ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کے گناہوں سے بچا جائے۔ پس روزہ گناہوں سے باز رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لیے ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''روزہ ڈھال ہے۔'' (بخاری شریف، کتاب التوحید: 7492)

روزہ کے ڈھال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ روزہ گناہوں اور دوزخ کی آگ سے بچاتا ہے۔ اگر روزہ کو پورے اہتمام اور احکام و آداب کی مکمل رعایت کے ساتھ پورا کیا جائے تو یقیناً گناہوں سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص روزہ میں صبح سے شام تک کھانے پینے اور دیگر خواہشات سے باز رہا لیکن اس دوران جھوٹ بھی بولا، جھگڑے بھی کیے اور چغلیاں بھی کھائیں تو اس سے فرض تو ادا ہو جائے گا مگر روزہ کی برکات اور ثمرات سے محروم رہے گا، جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جو شخص روزہ رکھ کر جھوٹی بات اور غلط کام نہ چھوڑے تو اللہ تعالیٰ کو کچھ حاجت نہیں کہ وہ (گناہوں کو چھوڑے بغیر) محض کھانا پینا چھوڑ دے۔'' (بخاری شریف، کتاب الصوم: 1903) معلوم ہوا کہ محض کھانا پینا اور خواہشات کو چھوڑ دینا اور گناہ نہ چھوڑنا، اس سے روزہ کامل نہیں ہوتا اور اس پر پورا ثواب نہیں ملتا۔ روزہ تبھی کامل ہوتا ہے جب کہ گناہوں سے بھی بچا جائے اور یہی روزے کا مقصد بھی ہے۔

ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ گندی باتیں نہ کرے، شور نہ مچائے۔ اگر کوئی شخص گالی گلوچ یا لڑائی جھگڑا کرنے لگے تو (اس کو گالی گلوچ سے جواب نہ دے بلکہ) یوں کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں۔'' (گالی گلوچ کرنا یا لڑائی جھگڑا کرنا میرا کام نہیں۔) (بخاری، کتاب الصوم: 1904) یعنی مطلب یہ ہے کہ اپنے روزے کو ناقص اور کمزور ہونے سے بچایا جائے اور ہر ایسے کام سے گریز کیا جائے جو روزے کے ثواب کو برباد کر دے۔ روزہ میں قرآن پاک کی تلاوت سے دل و زبان کو منور کیا جائے اور اللہ کے ذکر سے زبان کو تر رکھا جائے۔ کوئی گالی دے، یا برا بھلا کہے یا لڑائی پر اکسائے بھی تو یہ کہہ کر کہ میں روزے سے ہوں، اس سے الگ ہو جائے، اس کو گالی نہ دے اور اس سے لڑائی جھگڑا نہ کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یہ گنتی کے چند دن روزے رکھنے ہیں۔'' یعنی یہ 29 یا 30 دن روزوں کو رکھ لینا کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا کرنے کی ٹھان لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ ہمت بھی عطا فرماتے ہیں اور آسانیاں بھی فراہم کرتے ہیں۔

پیارے بچو!

رمضان المبارک نیکیاں اور اجر و ثواب بڑھانے کا مہینہ ہے۔ یہ صبر، غم خواری اور سخاوت کا مہینہ ہے۔ نیکیوں کے ساتھ اس کا استقبال کیجیے اور اس میں روزہ، تراویح، تلاوت، ذکر و اذکار وغیرہ سے اللہ کو راضی کیجیے۔ یقیناً اللہ کی رضا مندی اور خوشنودی ہی سب سے بڑی چیز ہے۔

اچانک ہی کوئی خیال اس کے ذہن میں آیا اور پھر وہ اپنے آگے جانے والے کا تعاقب کرنے لگا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کوئی انہونی بات ہونے والی ہے۔ آگے جانے والا شہر کی مرکزی سڑک سے ہوتا ہوا نسبتاً ایک سنسان علاقے میں آ گیا۔ اس نے مڑ کر ادھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ پیچھا کرنے والے نے ایک دیوار کی اوٹ لے لی، ورنہ دیکھے جانے کا خدشہ تھا۔

جب اسے یقین ہو گیا تو اس نے سامنے بنے کچرے کے بڑے سے ڈھیر کا رخ کیا۔ وہ بہت محتاط تھا۔ ڈھیر میں جا کر وہ اس میں موجود غلاظت کو کریدنے لگا۔ پیچھا کرنے والا ڈھیر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ بدستور کچرا کنڈی کی دیوار کی آڑ لیے ہوئے تھا۔ کچرے کو چھیڑنے میں ایسا تعفن اٹھا کہ اس کے دماغ میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ کچرے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والے کی قوت برداشت واقعی قابلِ دید تھی۔ اس کے ماتھے پر کوئی سلوٹ نہ آئی تھی۔ آخر کار اس کے انداز میں کچھ خوشی کی لہر آئی۔ اسے مطلوبہ چیز مل چکی تھی۔ اس نے جلدی جلدی اسے صاف کیا۔ پھر وہ احتیاط کے ساتھ اپنے ہاتھ میں موجود کپڑے کے تھیلے میں ڈال لی۔ اس نے وہاں سے نکلتے وقت بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ پیچھا کرنے والا آہستہ آہستہ سرک کر گلی میں داخل ہو گیا تھا۔ اسے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ اسے معلوم ہو چکا تھا۔ ......☆......

صدیوں پرانی بات ہے کہ ملک فارس میں شہریار نامی ایک سوداگر رہتا تھا۔ لوگ شہریار کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ بہت کھرا انسان تھا، سچ بولتا اور ہر ایک سے نرمی اور محبت سے پیش آتا۔ اس کے کاروبار میں کافی برکت تھی، اس لیے وہ نیکی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتا تھا۔

حج کا موقع تھا۔ شہر کے بہت سے لوگ حج پر جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شہریار کے دل میں خیال آیا کہ اس بار میرے کام میں بڑی برکت ہوئی ہے اس لیے میرا بھی فرض ہے کہ کچھ روپیہ نکال کر اس نیک کام پر خرچ کروں۔ یہ سوچ کر اس نے لوگوں کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ بھی خوش ہوئے اور انہوں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا ارادہ باندھ لیا۔

یہ جس زمانے کا ذکر ہے، اس زمانے میں ہوائی جہاز تھے نہ ریل گاڑیاں۔ لوگ اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہوتے یا پیدل قافلے بنا کر سفر کیا کرتے تھے۔

جب حاجیوں کا ایک قافلہ حج کے لیے تیار ہوا تو شہریار بھی اسی قافلے کے ساتھ حجاز مقدس جانے کے لیے روانہ ہوا۔ اخراجات کے لیے اس نے ایک ہزار اشرفیاں کمر بند میں ڈال کر کمر سے باندھ

لیں۔ یہ قافلہ آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ راستے میں تھوڑی دیر کے لیے کہیں پڑاؤ ڈالتا اور پھر اپنے اگلے سفر پر روانہ ہو جاتا۔

ایک دن قافلہ کوفے شہر میں جا پہنچا۔ بڑا شہر تھا، قافلے والوں نے یہاں دو تین دن ٹھہرنے کا فیصلہ کیا تاکہ آرام کر لیں اور گھوم کر شہر کی سیر بھی کر لیں۔ ایک دن تو لوگوں نے آرام کیا۔ دوسرے دن گھومنے کے لیے نکلے۔ شہریار بھی سیر کے لیے چل پڑا۔ پہلے تو اس نے شہر کو دیکھا، بازاروں کی رونق دیکھی۔ چوں کہ خود سوداگر تھا، لوگوں کو کاروبار میں لین دین کرتے دیکھا اور پھر سوچا کہ ذرا شہر کی فصیل سے باہر نکل کر میدانوں کی بھی سیر کرنی چاہیے۔

☆......☆

پیچھا کرنے والے کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ اب بھی اپنے کام میں مگن تھا۔ وہ تھیلے میں کچرے سے کچھ لے جانے والے کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ مختلف تنگ و تاریک گلیوں سے ہو کر ایک گھر میں داخل ہو چکا ہے۔ اب اسے اندر کا منظر دیکھنے کی خواہش تھی۔ اس نے ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو اسے ایک ادھ کھلی کھڑکی نظر آ گئی۔ اس نے اس میں سے جھانکنا شروع کیا۔ اندر کا منظر حیران کن تھا۔ اس نے دیکھا کہ باہر سے آنے والی بڑھیا گھر میں داخل ہوئی تو تین چار بچے ”امی جان! امی جان!!“ کہتے ہوئے اس سے لپٹ گئے۔

”ہمارے لیے کیا لائی ہیں؟“ بچوں نے معصومیت سے سوال کیا تو بڑھیا بولی:

”دیکھو! میں تمہارے لیے کیسی تازہ مرغی لائی ہوں۔ کھاؤ گے تو مزہ آ جائے گا۔“

یہ کہہ کر بوڑھی عورت نے تھیلے سے مرغی نکال کر بچوں کے آگے رکھ دی اور اپنا منہ دوسری طرف کر لیا تاکہ اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو اس کے بچے نہ دیکھ لیں۔

پیچھا کرنے والے نے یہ حالت دیکھی تو اس کا دل دہل گیا۔ اس نے سوچا ماں کی مامتا بھی کیا چیز ہے! یہ غریب بڑھیا اپنے بھوکے بچوں کے لیے اللہ جانے کیا کیا جتن کرتی ہو گی۔

وہ اس منظر کو زیادہ دیر نہ دیکھ سکا اور واپس اپنے خیمے میں لوٹ آیا۔ یہ شہریار تھا جو شہر کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ غربت ایسے دن بھی دکھاتی ہے کہ انسان مردار کھانے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ کسی اور طرف دھیان ہٹانے کی کوشش کرتا لیکن اس کی سوچ کی تمام سوئیاں اسی طرف آ کر اٹک جاتیں۔

شہریار جتنا اس جانب سوچتا گیا، رنجیدہ ہوتا گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے صبح ہوتے ہی اس محلے میں جانے میں دیر نہیں لگائی۔ اس نے پہلے بڑھیا کے ایک ہمسائے سے جا کر پوچھا:

”بھائی صاحب! آپ کے ساتھ والے مکان میں جو بوڑھی عورت رہتی ہے، یہ کون ہے؟“

ہمسائے نے بتایا: ”یہ بڑھیا بڑی نیک اور پاک باز عورت ہے، بہت غریب ہے بے چاری لیکن بڑی محنت اور مشقت سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔“

شہریار کی سوچ ہمدردی پہ مبنی تھی۔ اس کے دل نے اس سے کہا:

”ایسی غریب عورت کی مدد کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ حج تو میں پھر بھی کر سکتا ہوں، اس وقت تو اس عورت کو مدد کی زیادہ ضرورت ہے۔ جو روپیہ میرے پاس ہے اگر وہ اس بڑھیا کے کام آ جائے تو بہتر ہے۔“

یہ سوچ کر وہ بڑھیا کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اس نے تمام اشرفیاں نکال کر بڑھیا کے سامنے رکھ دیں اور کہا:

”بڑی اماں! تمہاری یہ امانت کافی عرصے سے میرے پاس پڑی ہے، اب واپس دینے آیا ہوں۔“

بڑھیا اسے دیکھ کر بہت حیران ہوئی اور بولی:

”میری کوئی امانت نہیں بلکہ میں تو تمہیں جانتی بھی نہیں، پھر میں یہ کیسے لے لوں؟“ دونوں میں بہت دیر تک بحث ہوتی رہی۔ شہریار اصرار کرتا رہا اور بڑھیا متواتر انکار کرتی رہی۔ آخر شہریار نے تنگ آ کر کہا: ”بی بی! اگر تم یہ اشرفیاں نہیں لو گی تو میں اس امانت کو اسی کچرے کے ڈھیر میں پھینک دوں گا، جہاں سے تم نے وہ مرغی اُٹھائی تھی۔ میں اب یہ امانت اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔“

بڑھیا نے سر جھکا دیا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کر کے آنسو گرنے لگے۔ اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھایا اور اشرفیاں اُٹھا لیں اور آہستہ آہستہ سے کہا: ”بیٹا! میں ناچیز اس قابل کہاں ہوں کہ تمہارے اس بڑے احسان کا بدلہ اتار سکوں، میرا اللہ ہی تمہیں اس نیکی کا اجر دے گا۔“ شہریار سرائے میں واپس آ گیا جہاں اس کے دیگر ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔

دوسرے دن جب قافلے نے چلنے کی تیاری شروع کی تو شہریار تنہا شہر کی طرف چلا گیا تاکہ کوئی کام کاج تلاش کرے اور کچھ کما کر

گھر کو لوٹ جائے۔ اسے شہر میں کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ آٹھویں دن صبح سویرے وہ سرائے سے باہر نکل ہی رہا تھا کہ ایک اونٹنی سوار آ پہنچا۔ شہریار کو مخاطب کرتے ہوئے بولا:

"کیوں بھئی نوجوان! کوئی کام وغیرہ کرو گے؟"

شہریار بولا: "ضرور کروں گا۔"

اونٹنی سوار نے کہا: "میں حج کے لیے مکہ جا رہا ہوں۔ اکیلا ہوں، چاہتا ہوں کہ میرا کوئی ساتھی ہو اور سفر کے کام میں میرا ہاتھ بٹائے۔ میرے پاس ایک اور اونٹنی بھی ہے، اس پر تم سوار ہو جاؤ۔"

شہریار کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی تھی۔ وہ فوراً اونٹنی سوار کے ساتھ ہولیا۔ دونوں نے حج کیا اور حج سے فارغ ہو کر کوفے کو لوٹ آئے۔ اونٹنی سوار نے شہریار کا شکریہ ادا کیا اور اپنا کمر بند کھول کر دس ہزار اشرفیاں نکالیں اور اس کی جیب میں ڈال دیں۔ شہریار نے پوچھا: "یہ کیا؟ میں نے کوئی اتنا بڑا کام تو نہیں کیا کہ آپ مجھے دس ہزار اشرفیاں معاوضہ دے رہے ہیں۔"

اونٹنی سوار نے کہا: "یہ مزدوری نہیں بلکہ یہ تمہاری امانت ہے، جو میرے پاس پڑی تھی۔" شہریار کچھ کہنے ہی کو تھا کہ وہ شخص فوراً اونٹنی پہ سوار ہوا اور دم بھر میں نظروں سے غائب ہو گیا۔ شہریار سوچ رہا تھا کہ اس نے حج کا ارادہ ترک کر کے ایک ہزار اشرفیاں نیک کام میں لگا دی تھیں، اللہ نے اس کی رقم دس گنا کر کے اسے لوٹا دی اور اس کا حج بھی ہو گیا۔ ☆☆☆

"کھوج لگائیے" میں حصہ لینے والے بچوں کے نام

عبداللہ اویس، گوجرانوالہ۔ محمد حذیفہ، لیہ۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ محمد وحید اسماعیل، لاہور۔ کائنات ریاض، مردان۔ سندس آسیہ، کراچی۔ محمد ابراہیم خالد، لاہور۔ اناقہ حیات، نوشہرہ کینٹ۔ جویریہ ادریس، سیال کوٹ۔ آیت شاہد، لاہور۔ محمد باسط خان، میانوالی۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ رانا محمد حسین، قصور۔ حمیز شاہد، ملتان۔ بشریٰ صفدر، تلہ گنگ۔ مہر آمنہ، اسلام آباد۔ عذن عمران، گوجرانوالہ۔ محمد زبیر، بہاول پور۔ نمیرہ محمود، لاہور۔ محمد مصعب علی، راول پنڈی۔ احمد عبداللہ، میانوالی۔ نمرہ فرید، لاہور کینٹ۔ فراز افضل، اٹک کینٹ۔ مناہل وسیم، لاہور۔ محمد زین العابدین، گوجرہ۔ فاطمہ تنزیلہ، سارہ جویریہ، حبیبہ، بہاول پور۔ قاری ندیم رضا عطاری، اوکاڑہ۔ سبیکا حاجرہ ڈوگر، فیصل آباد۔ حافظہ ثنا عروج، فیصل آباد۔ عدن سجاد، جھنگ صدر۔ شاہ زیب رمضان، گوجرانوالہ۔ حنا طاہر، ملتان۔ نوشین سلیم، بورے والا۔ احمد علی، حیدر آباد۔ ہمایوں مرزا، سیال کوٹ۔ سیرت فاطمہ فاروقی، رحیم یار خان۔ آمنہ اقبال، گوجرانوالہ۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ وردہ چوہدری، راول پنڈی۔ اقدس اکرام، اٹک۔ ذیشان رضا، آمنہ عبدالستار، چونگی۔ عادل عاصم، مریم عاصم، منڈی بہاؤ الدین۔ ساریہ نعمان، فارس نعمان، ملتان۔ عروۃ الوثقیٰ وڑائچ، بہاول نگر۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ انیام الحسن، اٹک۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ زونیرہ جاوید بٹ، گوجرانوالہ۔ نور العین، لاہور۔ اسامہ مختار احمد، ملتان۔ محمد قمر الزمان صائم، خوشاب۔ عاقل ارشد جٹ، گوجرانوالہ۔ تماضر ساجد، صادق آباد۔ طلحہ اسفند یار، ملتان۔ حسینہ زاہد، راول پنڈی۔ محمد طاہر علی، اسلام آباد۔ مناہل عثمانی، اسلام آباد۔ محمد حنفاء، واہ کینٹ۔ محمد حارث سعید، بورے والا۔ اسد امین، گوجرانوالہ۔ مہر اکرم، لاہور۔ علیشا اختر، کراچی۔ سید محسن بخاری، ملتان۔ نشوا اسلم ملک، بہاول پور۔ محمد اسعد، فیصل آباد۔ عائشہ گل سید، چارسدہ۔ آئمہ قریشی، اسلام آباد۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میر پور آزاد کشمیر۔ محمد احمد سعید، لاہور۔ مزمل سلیم قادری، گوجرانوالہ۔ رخشی آفتاب، کراچی۔ مشال رامین، لاہور۔ طلحہ خباب علی، اسامہ خباب علی، تلہ گنگ۔ سمیر فرید، اٹک۔ اصغر علی، وزیر آباد۔ مہد حسن، بھکر۔ شیرہ سلیمان بٹ، گوجرانوالہ۔ بریرہ فاروق، وزیر آباد۔ احمد حسنین وقار، ملتان۔ تغرید افتخار، واہ کینٹ۔ شفیق احمد، محمد وقاص، بورے والا۔ فاطمہ تحریم، کراچی۔ شریم اشرف غوری، اسلام آباد۔ فتح محمد شارق، خوشاب۔ محمد فاروق باجوہ، اسلام آباد۔ عافیہ حق، کراچی۔ محمد عثمان علی، بھکر۔ روا فاطمہ فریال، ثانیہ سردار، راول پنڈی۔ ولید احمد، اٹک۔ عروج طہٰ، پنڈ دادن خان۔ وقاص اشفاق، قبولہ شریف۔ نمرہ ظہور، فیصل آباد۔ ہشام الحق، کراچی۔

ساتھیو! آپ روزانہ آسمان کی گود میں اُڑتی ہوئی ننھی منی چڑیوں کو دیکھتے ہیں۔ یقیناً آپ کے ننھے منے سے دلوں میں بھی یہ آرزو پیدا ہوتی ہوگی کہ آپ بھی ان پرندوں کی طرح آسمان کی وسعتوں میں اپنے بازو پھڑ پھڑا کر اُڑیں۔ آپ کی یہ تمنا کوئی نئی نہیں ہے۔ اب سے چند صدیاں پہلے بھی انسان نے یہی کچھ سوچا تھا۔ چڑیوں کو اُڑتے دیکھ کر ہی اس کے دل میں یہ آرزو اُبھری تھی اور ان قدرتی ہوائی جہازوں کو دیکھ کر اس نے موجودہ ہوائی جہاز ایجاد کر ڈالا جس میں بیٹھ کر اگر تم ناشتہ کراچی میں کرو تو دوپہر کا کھانا بڑی آسانی سے لندن میں کھا سکتے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے چڑیوں کو آسمان کی حسین ترین مخلوق بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ انہیں بناتے وقت اُڑان کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے۔ ان کی جسمانی بناوٹ سے صاف ظاہر ہے کہ اس چھوٹے سے گوشت پوست کے لوتھڑے کو کچھ اس انداز سے ڈھالا گیا ہے جس سے وہ بآسانی ہزار ہا کلومیٹر کا سفر طے کر سکے۔ ان کے پروں اور بازوؤں کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ انہیں اُڑنے میں کسی قسم کی دشواری نہ ہو۔

خدا نے چڑیوں کو صرف ہمارا دل بہلانے کے لیے ہی نہیں بنایا بلکہ یہ ہمارے لیے نہایت مفید اور کارآمد بھی ہیں۔ بہت سی چڑیاں ہم پالتے بھی ہیں، ان سے ہمارے گھروں کی رونق بڑھتی ہے۔ ہم انہیں اپنی تنہائی کا ساتھی اور تفریح کا ذریعہ بناتے ہیں۔ بہت سی چڑیوں کے پر کام میں لائے جاتے ہیں۔ ان سے ہیٹ اور ٹوپیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہ ایسے کیڑے مکوڑوں کو بھی کھا جاتی ہیں جو زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں۔ بیجوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کام بڑی خوبی سے انجام دیتی ہیں جس سے ایک درخت کی نسل دوسری جگہ خود بخود پہنچ جاتی ہے۔

چڑیوں کا دماغ بہت نازک اور چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس ان کی آنکھیں بڑی اور تیز ہوتی ہیں۔ قدرت نے انہیں آنکھوں کے لیے ایک جھالر عنایت کی ہے جو ان کی آنکھوں کو کسی قدر ڈھکے رکھتی ہے۔ آنکھوں کا بہت تھوڑا سا حصہ اس کی زد سے باہر رہتا ہے تاکہ لمبی اُڑان کا اثر ان کی آنکھوں پر نہ پڑ سکے۔ اس طرح دھول و گرد و غبار، آندھی و طوفان کے جھکڑ اور بارش ان کی نظر پر کسی قسم کا بُرا اثر نہ ڈال سکے۔

عام طور پر چڑیوں کی دیکھنے کی قوت ہماری نظر سے دس گنا زیادہ تیز ہوتی ہے۔ چڑیوں میں قوت احساس بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سورج کا رُخ اور مقام دیکھ کر موسم کا اندازہ کر سکتی ہیں اور پھر محفوظ مقام پر چلی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر سخت سردی پڑنے پر وہ کسی قدر گرم خطوں کی جانب اُڑان شروع کر دیتی ہیں۔ اسی

طرح مناسب وقت پر ساحلی علاقوں میں بھی ان کا آنا جانا شروع ہو جاتا ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ان کے دل کی دھڑکن ایک سنٹ میں پانچ سو بار ہوتی ہے۔ ہمارے جسم کا ٹمپریچر 98.6 فارن ہائیٹ ہوتا ہے اور ان کے جسم کی حرارت عام طور پر 110 فارن ہائیٹ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ ہمارے جسم کی ہڈیاں سخت اور ٹھوس ہوتی ہیں لیکن چڑیوں کی نازک نازک سی ہڈیاں تیلیوں کی طرح ہلکی پھلکی اور کھوکھلی ہوتی ہیں تاکہ ان کا وزن کم سے کم ہو سکے۔

چڑیوں کی رفتار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بعض کی رفتار اس قدر تیز ہوتی ہے کہ تیز رفتار کیمرے بھی ان کی حرکات کی صحیح تصویر لینے میں ناکام رہتے ہیں۔ چڑیاں زمین پر اُترتے وقت اپنے پنجوں سے مدد لیتی ہیں۔ سینے کا حصہ بھی اُترنے میں ان کی مدد کرتا ہے۔ ان کے پنجے نازک ہوتے ہیں جن کی مدد سے یہ بآسانی زمین پر اُتر جاتی ہیں۔

چڑیاں اپنے رنگ ڈھنگ، آواز اور طبیعتوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں جس طرح انسانوں میں مختلف رنگ، نسل، مذہب اور عقیدے کے لوگ ہوتے ہیں۔ کچھ اسی انداز کی ان کی اپنی برادری بھی ہوتی ہے۔ آپ نے خوب صورت سے خوب صورت اور بدصورت سے بدصورت دونوں قسم کی چڑیاں دیکھی ہوں گی۔ کچھ چڑیوں کی مدھر آواز اچھی لگتی ہے اور کسی کی کڑوی آواز آپ کو بُری لگتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ میٹھی اور مدھر تانیں ہمارے لیے نہیں ہوتیں یہ تو صرف اپنے جوڑوں کو خوش کرنے اور اپنی طرف راغب کرنے کے لیے ان کا ایک پیغام ہوتا ہے۔

چڑیاں بڑی اچھی دست کار اور فن کار ہوتی ہیں۔ جفاکشی اور تن دہی سے تنکا تنکا اکٹھا کر کے اپنے گھونسلوں کی تعمیر کرتی ہیں۔ تنکوں کو ملا ملا کر اس ڈھنگ سے پروتی ہیں کہ اچھا خاصا ایک جال سا دکھائی دیتا ہے۔ کچھ چڑیوں کے گھونسلے اس قدر مضبوط ہوتے ہیں کہ اگر ان کی پانچ نسلیں بھی ان میں رہنا چاہیں تو بڑے مزے سے رہ سکتی ہیں۔

یہ ننھی منی چڑیاں بڑی پیٹو ہوتی ہیں۔ بعض چڑیاں جن کا اپنا وزن 21 گرام ہوتا ہے، 46 گرام تک دانہ چگ سکتی ہیں، یعنی اپنے وزن سے بھی زیادہ۔ ویسے عام طور پر چڑیاں دن بھر میں اپنے وزن کے برابر یا کم از کم اپنے وزن کا آدھا دانہ تو ہر حالت میں چگ لیتی ہیں۔ یہ نہ صرف اتنا کھانا کھاتی ہیں بلکہ دن بھر کی اُڑان اور اُچھل کود میں اسے بآسانی ہضم بھی کر لیتی ہیں۔

عام طور پر چڑیاں دو کلومیٹر کی بلندی تک اُڑ لیتی ہیں۔ اتنی ہی اُونچائی پر یہ رہ بھی لیتی ہیں۔ شدید گرمی کے موسم میں یہ میدانوں کو خیر باد کہہ کر اُونچے مقامات پر چلی جاتی ہیں۔ فاصلہ طے کرنے میں بھی یہ اپنی مثال آپ ہیں۔

سائنس دانوں کے مطابق پرندوں کی 8500 کے لگ بھگ قسمیں پائی جاتی ہیں جن میں سے زیادہ تعداد چڑیوں کی ہے۔

چڑیاں ایشیا، یورپ اور امریکا کے علاوہ دُنیا کے سبھی براعظموں میں پائی جاتی ہیں۔ برصغیر میں چڑیا ایک عام پرندہ ہے جسے گھریلو چڑیا بھی کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ چھوٹی جسامت کی ہوتی ہے۔ اس کا رنگ گندمی بھورا ہوتا ہے۔ اس کی دم چھوٹی اور چوڑی ہوتی ہے۔ اس کی چونچ کافی مضبوط ہوتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ دانے چگنے والی ہے۔ ساتھ ساتھ یہ چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو بھی کھا جاتی ہے۔ اس کو گھریلو چڑیا اس لیے کہتے ہیں کہ یہ گھروں میں اپنا بسیرا کرتی ہے۔

چڑیا اتنا عام پرندہ ہے کہ اس پر بچوں کی دل چسپ کہانیاں، نظمیں اور گیت وغیرہ بھی موجود ہیں۔ چھوٹے بچوں کی درسی کتب میں ''ننھی منی چڑیا'' کے نام سے متعدد اسباق بھی موجود ہیں۔

گھریلو چڑیا عام طور پر ہجرت نہیں کیا کرتی بلکہ یہ انسانی آبادیوں کے قرب و جوار میں خود کو محدود رکھتی ہیں۔ بعض اوقات یہ خانہ بدوشی حالت میں دُور تک نکل جاتی ہیں لیکن یہ مقامی نقل مکانی ہوتی ہے جس کا سبب خوراک کی تلاش ہوتا ہے۔ اسے دیگر پرندوں کی دُور دراز ہجرت میں شمار نہیں کیا جاتا۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق پاکستان میں اس وقت پرندوں کی 786 سے زائد نسلیں پائی جاتی ہیں جن میں سے 37 سے زائد نسلوں کو اپنی زندگی بچانے کے لالے پڑ چکے ہیں۔ پاکستان میں اس حوالے سے دیہات کی نسبت شہروں کی صورت حال اس لیے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ بہت سے ایسے پرندے جو صبح شام ہمیں اپنے گھروں میں نظر آتے تھے، آج چند ایک باغات تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ انہی میں ایک گھریلو چڑیا بھی ہے جن کی تعداد میں تیزی سے کمی ہو رہی ہے۔

چڑیا کی نسل معدوم ہونے کے ساجی اسباب بھی ہیں۔ مثلاً خوش خوراک حضرات کو پرندوں کے علاوہ چڑیا اور چڑے تناول

فرمانے کا شوق ہے۔ اس مقصد کے لیے شکاری حضرات زندہ چڑیوں کو پکڑ کر شوقین افراد کو فروخت بھی کرتے ہیں۔

اسلام نے حیات کا کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا، جس میں اس نے اپنے ماننے والوں کی راہنمائی نہ فرمائی ہو۔ اسلام نے جہاں انسانوں سے انسانیت، حسن اخلاق اور اقلیتوں سے مل کر اتحاد و اتفاق سے رہنے کا درس دیا ہے وہاں ہمیں جانوروں کے حقوق سے بھی آگاہ کیا ہے۔ ہر جان دار کے کچھ حقوق متعین کیے گئے ہیں۔ اسلام کے مطابق آپ میں سے بہترین وہ ہے جو اللہ کی مخلوق کو زیادہ فائدہ پہنچانے والا ہو۔ مسلمان اللہ کی ہر مخلوق کا خیر خواہ ہوتا ہے، کیوں کہ اسلام تو سراسر امن و سلامتی و خیر خواہی کا پیغام دیتا ہے۔ اسلام نے تو اپنے پیروکاروں کو جانوروں سے بھی حسن سلوک کا درس دیا اور ان پر رحم کرنے کا حکم دیا ہے۔

ایک دفعہ ایک صحابیؓ آقا حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ ان کے ہاتھ میں کسی پرندے کے چھوٹے بچے تھے جو چیں چیں کر رہے تھے۔ آپؐ نے ان بچوں کے بارے میں پوچھا تو سرکارؐ سے صحابیؓ نے عرض کیا۔ میں ایک جھاڑی سے گزرا تو ان بچوں کی آواز آ رہی تھی۔ میں انہیں اُٹھا کر لایا۔ ان کی ماں نے دیکھا تو بے تاب ہو کر میرے گرد چکر کاٹنے لگی۔ یہ سن کر رحمت دو عالمؐ نے فرمایا کہ فوراً جاؤ ان بچوں کو وہیں رکھ کر آؤ جہاں سے تم نے ان کو اُٹھایا تھا۔

حضرت عبداللہ جعفرؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالمؐ ایک انصاری کے احاطے میں داخل ہوئے جس میں ایک اونٹ بندھا ہوا تھا۔ اونٹ نے آپؐ کو دیکھا تو بلبلانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔ حضور پاکؐ اس کے قریب تشریف لائے۔ اس کے کوہان اور کنپٹیوں پر اپنا دستِ مبارک پھیرا تو اونٹ کو سکون ہو گیا۔ پھر آپؐ نے اونٹ کے مالک کے بارے میں پوچھا تو ایک انصاری سن کر آگے آ گیا۔ رسول پاکؐ نے اس جوان سے فرمایا کہ تم اس جانور کے معاملے میں جس کا مالک اللہ نے تم کو بنایا ہے، اللہ سے ڈرتے نہیں اور اسے ہر وقت کام میں لگائے رکھتے ہو۔ وہ مجھ سے شکایت کر رہا ہے کہ تم اس کو تکلیف دیتے ہو۔ آقائے دو جہاںؐ نے صحابہ کرامؓ کو جانوروں کو وقت پر چارہ اور پانی دینے کا حکم دیا اور ان کو پریشان کرنے اور ان کی طاقت سے زائد ان پر بوجھ لادنے سے منع فرمایا۔

ساتھیو! ہم سب کا فرض ہے کہ ہم بھی اسوۂ نبوی ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے اپنے پالتو جانوروں اور دوسرے سب جانوروں کا خیال کریں اور ان کو تکلیف نہ پہنچائیں۔

20 مارچ کو پاکستان سمیت دُنیا بھر میں چڑیوں کی حفاظت کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اس دن کے منانے کا مقصد دُنیا بھر میں گھروں کی خوب صورتی کا باعث بننے والی چڑیوں کی تیزی سے ختم ہوتی نسل کو بچانے کے لیے عوامی شعور اُجاگر کرنا ہے۔

☆☆☆

بچے نرسری میں

بچوں کی نرسری کو اگر اچھی طرح چلایا جائے تو اس سے بچوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے، مگر اس نرسری کا عملہ تخیل اور اختراع سے کام نہ لے تو نرسری بچوں کے لیے باعثِ زحمت ثابت ہوتی ہے۔ نرسری میں بچوں کو جو تعلیمی خطرے پیش آ سکتے ہیں، وہ یہ ہیں:

دلچسپ مشاغل کی بجائے ابجد اور گنتی پر زور سے بچوں میں تعلیم کے خلاف نفرت کا اُبھرنا، سب بچوں کو ایک جیسا سمجھنے اور انہیں ایک ہی طرح سوچنے اور کام کرنے پر مجبور کرنے سے بچوں کی انفرادی صلاحیتوں کا کشت و خون ہونا، ننھے بچوں سے بالغ توقعات رکھنا اور انہیں ان کی ہمت اور بساط سے کہیں زیادہ کام دے دینا، مشکل دعاؤں اور نظموں کے رٹے لگوانے سے بچوں کے سوچ بچار کا کند ہونا وغیرہ۔

بچوں کو ان خطروں سے بچانا بے حد ضروری ہے۔ نرسری کا عملہ بچوں کی تعلیم و تربیت کے اصولوں اور طریقوں میں تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔ کھیلوں کی تنظیم یوں ہونی چاہیے کہ ہر بچہ کسی نہ کسی کھیل سے ضرور لطف اندوز ہو سکے۔ گنتی اور ابجد صرف تعلیم بذریعہ کھیل کے طریقوں سے سمجھانی چاہیے۔ بچوں کی انفرادی صلاحیتوں اور رجحانوں کو سمجھنے کی کوشش ہونی چاہیے۔

اگر ممکن ہو تو موسیقی کا تھوڑا بہت اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ بچوں کے والدین سے رابطہ ہونا چاہیے اور بچوں کو نرسری میں پیش آنے والے روز مرہ مسائل سے والدین کو آگاہ کرتے رہنا چاہیے۔

والدین کو بھی چاہیے کہ وہ بچوں کو داخل کرانے سے پہلے نرسری کی اخلاقی اور تعلیمی فضا سے متعلق اچھی طرح چھان پھٹک کر لیں۔ داخلہ کے بعد نرسری کے عملہ سے رابطہ رکھیں اور بچے کی بہتری کے لیے ان سے ہر ممکن تعاون کریں۔

بیگم نثار حسین ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ گھر میں نوکر چاکر بھی تھے۔ بابا شفقت ان کا پرانا خانساماں تھا۔ وہ بہت ایمان دار اور نیک آدمی تھا۔ وہ کچھ دنوں کی چھٹی لے کر گاؤں جانا چاہتا تھا، لہٰذا فوری طور پر بابا شفقت نے بیگم صاحبہ کو ایک خانساماں کا انتظام کر کے دے دیا تھا۔ بیگم نثار حسین ایک سوشل ورکر بھی تھیں، ان کے گھر میں لوگوں کا آنا جانا رہتا تھا۔ بیگم صاحبہ نے ضرورت کے پیش نظر اس خانساماں کو رکھ لیا۔ بیگم نثار حسین کی عادت تھی کہ وہ رات کو اپنا میک اَپ اُتارنے کے بعد لازمی غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھوتی تھیں۔ ایک دن وہ معمول کے مطابق منہ دھو رہی تھیں کہ اچانک کھڑکی سے ایک نقاب پوش نے بیگم صاحبہ پر خنجر سے حملہ کر دیا۔ بیگم صاحبہ نے کمال ہوشیاری سے نقاب پوش کے حملے کو روکتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

پیارے بچو! بتایئے بیگم نثار حسین کو کیسے پتا چلا کہ ان کے عقب سے کوئی شخص حملہ کر رہا ہے؟

مئی میں شائع ہونے والے ''کھوج لگایئے'' کا صحیح جواب یہ ہے:
پیارے بچو! اس کھٹے میٹھے پھل کا نام آلوچہ ہے۔

مئی 2015ء کے کھوج لگایئے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- محمد خان، لاہور
2- حافظہ فاطمہ صدیقی، کندیاں
3- عزہ اسلم، فیصل آباد
4- محمد احسان، لاہور
5- سیدہ فزا انیس، لاہور

اَلصَّمَدُ جَلَّ جَلاَ لُہٗ (جو کسی کا محتاج نہیں، سب اس کے محتاج ہیں)

اَلصَّمَدُ جَلَّ جَلاَ لُہٗ کو اپنے کام کرنے میں کسی کی ضرورت نہیں پڑتی اور جو کسی کا محتاج نہیں اور سب کے سب اس کے محتاج ہیں۔

حضرت جبرائیل علیہ السلام سے لے کر ایک چیونٹی تک۔ چھوٹی سے چھوٹی مخلوق اور بڑی سے بڑی مخلوق سب اسی کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔

ستر ہزار فرشتے

حضرت معاویہ ابن معاویہ لیثی رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ ان کا انتقال مدینے میں ہوا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ ان کے جنازے میں شرکت فرمائی۔ ان کے جنازے کو لے کر ایک میدان میں لائے جس کا نام تبوک ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے جنازے کی نماز تبوک میں ہی پڑھی اور پھر جنازہ واپس مدینے میں لایا گیا اور ان کو جنت البقیع، قبرستان میں دفن کیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا: ''انہیں یہ اعزاز کیوں ملا؟'' تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا: ''یہ کثرت سے سورۂ اخلاص پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے یہ اعزاز ملا۔''

ترجمہ: ''کہہ دو کہ اللہ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور اس کے جوڑ کا کوئی بھی نہیں۔''

اس سورت میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے تین مبارک نام ہیں:

1۔ اَللّٰہُ 2۔ اَلْاَحَدُ 3۔ اَلصَّمَدُ

ایک شخص

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص نماز ادا کرتے ہوئے التحیات میں یہ کہہ رہا ہے: ترجمہ: ''اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! بے شک تُو ایک ہے۔ تُو کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب تیرے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اس کے برابر کوئی نہیں۔ تُو میرے گناہوں کو بخش دے، بے شک تُو ہی بہت زیادہ مغفرت فرمانے والا اور رحم کرنے والا ہے۔'' تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بے شک اس کی مغفرت کر دی گئی، بے شک اس کی مغفرت کر دی گئی۔''

یاد رکھنے کی باتیں

1۔ سورۂ اخلاص یاد کر لیں۔ صبح و شام سورۂ اخلاص کے ساتھ سورۂ فلق اور سورۂ ناس تین تین مرتبہ پڑھیں۔ اس طرح پڑھنے سے ان شاء اللہ ہر تکلیف دینے والی چیز سے حفاظت ہو جائے گی۔

2۔ ہم سب ہر چیز میں اللہ کے محتاج ہیں تو ہر ضرورت کے وقت اسی سے مانگیں۔ اگر پین، پنسل، کاپی کی ضرورت پڑے تو اسی سے سوال کریں۔ اسی سے مانگنے کی عادت ڈالیں۔

☆☆☆

چند دن قبل میری ملاقات پڑوس میں رہنے والے اکرام صاحب کے بیٹے منیب احمد سے ہوئی تو اُس نے باتوں باتوں میں بتایا کہ گزشتہ رمضان بہت یاد آتا ہے۔ ہم فیصل آباد میں ہوتے تھے، میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ رمضان کے ماہِ مبارک میں اسکول والوں نے ہر روز صبح کی اسمبلی میں رمضان کے حوالے سے بڑے دلچسپ پروگرام پیش کیے تھے۔ اسکول والوں نے رمضان شروع ہونے سے قبل اعلان کیا تھا کہ ہم ایک مقابلہ کروا رہے ہیں، جس میں اسکول کے تمام بچے حصہ لے سکتے ہیں۔ مقابلہ میں حصہ لینے والے بچوں کو ایک نوٹ بک بنانا ہوگی جس میں صبح کی اسمبلی میں رمضان کے حوالے سے ہونے والی تقاریر، درس، نظمیں وغیرہ خوبصورت اور کم سے کم اغلاط کے ساتھ لکھنی ہوں گی۔ رمضان کے بعد تمام نوٹ بکس کا جائزہ لیا جائے گا۔ بہترین نوٹ بک تیار کرنے والے کو رمضان ٹرافی اور دوسرے انعامات دیئے جائیں گے۔ میں نے بہت محنت کی تھی، مجھے اوّل انعام دیا گیا تھا۔ میں نے منیب احمد سے پوچھا کہ کیا وہ نوٹ بک تمہارے پاس محفوظ پڑی ہے۔ اس نے بتایا کہ ہاں، اسے بہت سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ میں نے وہ نوٹ بک دیکھی تو میں بھی اسے انعام دینے پر مجبور ہوگیا۔ اس کی نوٹ بک میں سے کچھ چیزیں آپ کی دلچسپی کے لیے میں نے منتخب کی ہیں۔

ماہ مبارک

آج ماہ شعبان کی 28 تاریخ ہے۔ پرنسپل صاحب نے صبح کی اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ رمضان کا چاند نظر آتے ہی رمضان کا مبارک مہینہ شروع ہو جائے گا۔ ہم مسلمانوں کا فرض ہے کہ اس برکتوں والے مہینے کا شایانِ شان استقبال کریں۔

رمضان کا چاند دیکھنا بھی انسان کے اشتیاق کو ظاہر کرتا ہے۔ چاند دیکھنے کی پوری پوری کوشش کریں۔ چاند دیکھ کر دُعا ضرور کرنی چاہیے۔ دُعا تو عربی میں انہوں نے بتائی تھی لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ آپ اُردو میں بھی دُعا مانگ سکتے ہیں۔ دُعا کا ترجمہ یہ ہے: ”اللہ اکبر۔ خدایا یہ چاند ہمارے لیے امن و ایمان، سلامتی اور اسلام کا چاند بنا کر طلوع فرما۔ اور ان کاموں کی توفیق کے ساتھ جو تجھے اور تیرے محبوب کو پسند ہیں۔ اے چاند! ہمارا رب اور تیرا رب اللہ ہے۔“

پہلا روزہ

آج پہلا روزہ تھا، بہت سارے بچوں نے روزہ رکھا ہوا تھا۔ ایک عالمِ دین بچوں سے خطاب کرنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ انہوں نے رمضان کے حوالے سے بہت اچھی باتیں ہمیں بتائیں۔ انہوں نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا: یہ عظمت و برکت والا مہینہ خدا کی خصوصی عنایت اور رحمت کا مہینہ ہے۔ یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں اللہ کی رحمت اپنے جوش پر ہوتی ہے۔ انسان کو اس ماہِ مبارکہ میں اپنی عادات پر پورا کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دُنیا بھر کے ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ صبح سویرے اُٹھنا صحت کے لیے بہت زیادہ فائدہ مند ہے۔ آپ بچے کوشش کیا کریں کہ سحری کے وقت اُٹھ جایا کریں اور گھر کے کسی بڑے فرد کے ساتھ مسجد نماز پڑھنے جایا کریں۔

روزہ کا اصل مقصد

آج میرے دوست نعمان کے والد شبیر صاحب مارننگ اسمبلی میں تشریف لائے تھے۔ ان کی تقریر کا موضوع تھا۔ ”روزہ

کے اصل مقاصد۔'' انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا۔

نبی ﷺ نے مختلف طریقوں سے روزے کے اصل مقصد کی طرف توجہ دلائی ہے اور یہ سمجھایا ہے کہ مقصد سے غافل ہو کر بھوکا پیاسا رہنا کچھ مفید نہیں۔ حضور پاکؐ نے فرمایا: جس کسی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا ہی نہ چھوڑا تو اس کا کھانا اور پانی چھڑا دینے کی اللہ کو کوئی حاجت نہیں۔ دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ روزے سے بھوک پیاس کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا اور بہت سی راتوں کو کھڑے رہنے والے ایسے ہیں کہ اس قیام سے رت جگے کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔

ان دونوں حدیثوں کا مطلب بالکل واضح ہے۔ ان سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ محض بھوکا اور پیاسا رہنا عبادت نہیں ہے بلکہ اصل عبادت کا ذریعہ ہے۔ اصل عبادت ہے خوف خدا کی وجہ سے خدا کے قانون کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ محبت الٰہی کی بناء پر ہر اس کام کے لیے شوق سے لپکنا جس میں محبوب کی خوشنودی ہو اور نفسانیت سے بچنا، جہاں تک بھی ممکن ہو۔ اس عبادت سے جو شخص غافل رہا، اس نے خواہ مخواہ اپنے پیٹ کو بھوک پیاس کی تکلیف دی۔ اللہ تعالیٰ کو اس کی حاجت کب تھی کہ بارہ چودہ گھنٹے کے لیے اس سے کھانا پینا چھڑا دیتا؟

رمضان اور بدلتے موسم

آج گورنمنٹ کالج سے جغرافیہ کے پروفیسر صاحب تشریف لائے تھے، انہوں نے بہت ہی دلچسپ باتیں بتائیں۔ انہوں نے خاص بات یہ بتائی کہ مہینے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ مہینے ہیں جنہیں شمسی مہینے کہتے ہیں۔ ایک سال میں یہ بارہ مہینے ہیں اور انسان نے اپنی سوچ سے سال کے 365 دنوں کو بارہ حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے لیکن قمری مہینے چاند کی زمین کے گرد گردش سے وجود میں آتے ہیں۔ ایک قمری مہینہ 29 یا 30 دن کا ہوتا ہے۔ قمری سال شمسی سال سے دس دن چھوٹا ہوتا ہے، اس لیے ہر سال رمضان پچھلے سال کے مقابلے میں دس دن پہلے آجاتا ہے۔ اس طرح تقریباً تیس سال کے بعد وہی مہینہ آتا ہے۔ اس میں ایک بڑی خاص بات ہے کہ رمضان ہر قسم کے موسم میں آتا رہتا ہے۔ آج کل سخت گرمی کے روزے ہیں، چند سالوں بعد یہ موسم بہار میں آجائیں گے، پھر اس کے بعد آپ سردیوں کے روزے دیکھیں گے۔ انشاء اللہ!

رمضان المبارک اور قرآنِ پاک

آج جامع مسجد کے خطیب صاحب تشریف لائے تھے۔ ان کی تقریر کا موضوع تھا۔ ''رمضان المبارک اور قرآن پاک۔'' انہوں نے فرمایا: ''اس ماہِ مبارکہ میں بچہ ہو یا بڑا، ہر ایک کو تلاوتِ قرآن کا خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔ اس مہینے کو قرآنِ پاک سے خصوصی مناسبت ہے۔ حضرت جبریلؑ ہر سال رمضان میں پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کو پورا قرآن سناتے اور سنتے تھے اور آخری سال آپؐ نے دو بار رمضان میں نبیؐ کے ساتھ دور فرمایا۔ قرآن پاک اسی مہینے میں نازل ہوا اور دوسری آسمانی کتابیں بھی اسی مہینے میں نازل ہوئیں۔

تمام مساجد میں تراویح میں پورا قرآن سنانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ ایک بار رمضان میں پورا قرآن پاک سننا مسنون ہے۔ ہماری مسجد میں بہت سارے بچے تراویح پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ ہر مسجد میں کچھ نہ کچھ بچے نماز کے دوران شرارتیں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ تمام بچے کوشش کیا کریں کہ جب بھی مسجد میں داخل ہوں تو مسجد کا احترام ملحوظ رکھیں تاکہ اللہ آپ سے خوش ہو۔ اللہ انسان پر بہت مہربان ہے۔

آج ہمارے قاری صاحب نے تقریر کی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ اسلام ہر انسان کا خیال رکھتا ہے۔ کوئی بھی عبادت ہو، اللہ تعالیٰ انسان کی نیت یعنی ارادے کو دیکھتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنا لازمی ہے لیکن اگر انسان ایسی جگہ ہو جہاں پانی موجود نہیں ہے یا وہ بیمار ہے تو اللہ تعالیٰ نے تیمم کرنے کی اجازت دی ہے۔ آدمی سفر میں ہے تو وہ نماز قضا بھی کر سکتا ہے۔ بیمار ہے تو بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا ہے۔ اسی طرح بیمار آدمی کے لیے اور مسافر کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی رعایت ہے کہ وہ روزہ قضا بھی کر سکتا ہے۔

چھوٹے بچوں پر روزہ فرض نہیں ہے۔ چھوٹے بچوں کو روزہ رکھنے پر مجبور بھی نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں آہستہ آہستہ ذہنی طور پر روزے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ بہرحال بچوں کو روزے کا احترام کرنے کی عادت ڈالنی چاہیے، یعنی بچوں کو لوگوں کے سامنے اس ماہ میں بھی کھانا پینا نہیں چاہیے۔

روزہ ایک مخفی عبادت ہے

آج ایک معزز مہمان نے خطاب کیا تھا۔ میں ذرا سا لیٹ ہو گیا تھا، اس لیے مجھے ان کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ انہوں نے بتایا کہ دوسری عبادات کے برخلاف روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا حال خدا اور بندے کے سوا کسی دوسرے پر نہیں کھل سکتا۔ ایک شخص سب کے سامنے سحری کھائے اور افطار کے وقت تک ظاہر میں کچھ

نہ کھائے پیئے، مگر چھپ کر پانی پی جائے یا کچھ چوری چھپے کھا پی لے تو خدا کے سوا کسی کو بھی اس کی خبر نہیں ہو سکتی۔ اس عبادت کا یہ ایک ایسا خاص پہلو ہے جس کی وجہ سے اس کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انعامات بھی بہت زیادہ ہیں۔

میرا پہلا روزہ

آج بڑا دلچسپ پروگرام منعقد کیا گیا تھا۔ کوئی پابندی تو نہیں تھی لیکن باری باری جو طالب علم چاہتا تھا، اپنے پہلے روزے کے بارے میں بتا سکتا تھا۔ میرے دوست عرفان علی نے بتایا کہ جب میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا، میں نے زبردستی روزہ رکھ لیا اور کسی کو بتایا نہیں۔ اسکول سے چھٹی کے بعد جب میں گھر واپس آیا تو گھر والوں کو میرے روزے کا علم ہوا۔ والدہ صاحبہ لیکچر دینے بیٹھ گئیں۔ بیٹا! آپ کا روزہ ہو گیا، آپ دوپہر کا کھانا کھا لو۔ کھانا کھا کر پھر روزہ رکھ لینا۔ میں نے کہا، اس طرح تو اللہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ انہوں نے ابو کو دفتر فون کر دیا۔ وہ بھی چھٹی لے کر آ گئے۔ انہوں نے مجھے کچھ کہا تو نہیں لیکن میری طرف اپنی پوری توجہ مبذول کیے رکھی کہ جونہی مجھے کچھ ہو تو وہ مجھے سنبھال لیں۔ پوری فیملی کو فون کر کے بتایا جا رہا تھا کہ عرفان نے آج پہلا روزہ رکھا ہے۔ کئی لوگ ٹیلی فون پر میری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ شام کو کئی رشتہ دار میرے لیے افطاری کا سامان لے کر آ گئے۔

روزے کے بارے میں عجیب وغریب واقعہ

آج ایک بہت بڑے سرکاری افسر مارننگ اسمبلی میں مہمان خصوصی تھے۔ انہوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔ ایک دفعہ یہاں پاکستان سے ایک صاحب سرکاری ڈیوٹی پر چین گئے تھے۔ اس وقت چیئرمین ماؤزے تنگ زندہ تھے۔ کچھ دیر کے لیے وہ ایک ہال میں بیٹھتے تھے۔ ہر فرد ان سے ہاتھ ملاتا اور آگے چلا جاتا۔ جب اس پاکستانی افسر کی باری آئی تو ماؤزے تنگ نے ہاتھ ملاتے ہوئے ان سے پوچھا کہ آپ کا تعلق کس ملک سے ہے۔ افسر نے بتایا: ''میں پاکستانی ہوں۔'' وہاں ایک کرسی پڑی تھی ماؤزے تنگ نے اشارہ کیا کہ اس پر تشریف رکھیں۔ جب وہ بیٹھ گئے تو ماؤزے تنگ نے کہا: ''میرے دوست! تمہارا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جو ہمیشہ کامیاب وکامران ہو گی۔'' وہ افسر حیران ہو کر ماؤزے تنگ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ماؤزے تنگ نے کہا کہ یہ بات میں اس لیے یقین کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ ایک چینی افسر سخت گرمی کے موسم میں پاکستان گیا تھا۔ واپس آ کر اس نے بتایا کہ میں ایک پاکستانی افسر کے پاس بیٹھا تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ پاکستانی افسر بار بار غسل خانے میں جاتا ہے اور پھر بات آگے چلتی ہے۔ چینی افسر نے اس سے پوچھا کہ بار بار غسل خانہ میں جانے کی کیا وجہ ہے۔ اس نے بتایا کہ رمضان ہے، بار بار حلق سوکھ جاتا ہے۔ میں سر پر تھوڑا سا پانی ڈالتا ہوں تو طبیعت کچھ دیر کے لیے سنبھل جاتی ہے۔ چینی افسر نے کہا کہ آپ پانی کیوں نہیں پیتے۔ وہ افسر بولا کہ روزے کی حالت میں پانی نہیں پی سکتے۔ چینی افسر نے کہا کہ آپ کو یہاں کوئی نہیں دیکھ رہا، آپ پانی پی لیں۔ وہ پاکستانی مسکرایا، انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور کہا وہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔

سعودی عرب میں ماہِ رمضان

وہ کتنے خوش نصیب لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ مقامات مقدسہ پر رمضان کے روزے رکھنے کی توفیق دیتا ہے۔ آج محمد کاشف صاحب اسمبلی میں شریک ہوئے تھے۔ ان صاحب نے بتایا کہ پچھلے سال ہماری فیملی نے رمضان کا مبارک مہینہ مکہ اور مدینہ کی مقدس فضاؤں میں گزارا۔ رمضان میں دونوں مقامات پر ایک جشن کا سماں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے نورِ خداوندی برس رہا ہے۔ اہلِ عرب دُنیا بھر سے آئے ہوئے مہمانوں کی دل کھول کر خدمت کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دُنیا کا سب سے لمبا دسترخوان مکہ میں افطاری کے وقت بچھایا جاتا ہے۔ افطاری میں آدمی اتنا کھا پی لیتا ہے کہ رات کو دوبارہ کھانا کھانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ دُنیا کے ہر ملک کا مسلمان وہاں نظر آتا ہے اور حقیقی معنوں میں دُنیا گلوبل ولیج محسوس ہوتی ہے۔

الوداع ماہِ رمضان، الوداع

آج سب سے پہلے تو پرنسپل صاحب نے اعلان کیا کہ کل سے عید مبارک کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ ماہِ رمضان کے دو یا تین دن ابھی باقی ہیں۔ آج پروفیسر مشتاق صاحب تشریف لائے ہیں۔ آپ کی تقریر کا عنوان ہے۔ ''الوداع، ماہِ رمضان الوداع۔''

پروفیسر صاحب نے فرمایا: برکتوں، رحمتوں اور اللہ عزوجل کی مہربانیوں کا مہینہ بلکہ از روئے حدیث اللہ تعالیٰ کا مہینہ ''رمضان'' ہمیں الوداع کہہ کر رخصت ہونے والا ہے۔ ماشاء اللہ بہت سے خوش نصیبوں نے رمضان میں خوب کمائی کی۔ خوب نیکیاں لوٹیں اور خوب اللہ عزوجل کی رحمتیں حاصل کیں۔ پیارے بچو! آپ نے رمضان میں جس طرح اللہ کی عبادت کی ہے، اللہ سے آپ کا جو تعلق بنا ہے، اسے آپ نے رمضان کے بعد بھی کمزور نہیں ہونے دینا ہے۔ ☆☆☆

درج ذیل دیئے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ بیعتِ رضوان کرنے والے صحابہؓ کو کیا کہا جاتا ہے؟

i۔ عشرہ مبشرہ ii۔ اصحاب الشجر iii۔ اصحاب بدر

2۔ خون میں کتنے قسم کے خلیے ہوتے ہیں؟

i۔ چار قسم ii۔ تین قسم iii۔ ایک قسم

3۔ شعر کا دوسرا مصرع بتایئے:

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن ....

4۔ قدیم یونان کا مشہور شاعر اندھا تھا، اس کا نام بتایئے۔

i۔ ملٹن ii۔ ہومر iii۔ شیلے

5۔ مسدس کا ہر بند کتنے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے؟

i۔ تین مصرے ii۔ چھ مصرے iii۔ پانچ مصرے

6۔ کون سا جانور ہوا میں کھڑا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے؟

i۔ کاؤ کاؤ ii۔ شکرا iii۔ قناری

7۔ حضرت علی ہجویریؒ کا مزار کس نے تعمیر کروایا تھا؟

i۔ بہلول لودھی ii۔ ابراہیم لودھی iii۔ فیروز شاہ تغلق

8۔ حضرت علیؓ کی تحریر کردہ شہرہ آفاق کتاب کا نام کیا ہے؟

i۔ نہج البلاغہ ii۔ کشف المحجوب iii۔ قصص الانبیاء

9۔ تیراکی کے لیے کون سا پانی سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے؟

i۔ تازہ پانی ii۔ نمکین پانی iii۔ دریائی پانی

10۔ رئیس الاحرار کس شخصیت کا خطاب ہے؟

i۔ مولانا محمد علی جوہر ii۔ حسرت موہانی iii۔ عبدالرب نشتر

جوابات علمی آزمائش مئی 2015ء

1۔ ہاشم 2۔ ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات! 3۔ خلا
4۔ اللہ تعالیٰ 5۔ جابر بن حیان 6۔ وٹامن ای 7۔ سوا چار انچ
8۔ ہری پور، ہزارہ 9۔ قائداعظم 10۔ تسبیح پڑھنے والا

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیئے جارہے ہیں۔

☆ عائشہ تبسم، لاہور (150 روپے کی کتب)
☆ محمد مصعب، راول پنڈی (100 روپے کی کتب)
☆ ماہ رُخ، حیدرآباد (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
حافظ ثناء عروج، فیصل آباد۔ لیبہ ناصر، عمرہ ناصر، لاہور۔ حسینہ زاہد، راول پنڈی۔ محمد طاہر علی، اسلام آباد۔ سیرت فاطمہ فاروقی، رحیم یار خاں۔ افہام الحسن، اٹک۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ اقدس اکرام، فتح جھنگ۔ حذیفہ اویس، فیصل آباد۔ عروۃ الوثقیٰ وڑائچ، بہاول نگر۔ حافظ محمد الیاس عاجز، رانا علی محمد، خوشاب۔ طلحہ فاروق ہاشمی، راول پنڈی۔ سعد احمد، فیصل آباد۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میرپور۔ محمد قمر زمان صائم، خوشاب۔ طلحہ خباب علی، اسامہ خباب علی، تلہ گنگ۔ مشیرہ سلمان بٹ، گوجرانوالہ۔ تغرید افتخار، واہ کینٹ۔ طلحہ صفدر، ملتان۔ ثیزہ جاوید، گوجرانوالہ۔ عثمان افضل، سرگودھا۔ ردا فاطمہ فریال، راول پنڈی۔ محمد مقدم علی، فیصل آباد۔ ایمن افضل، اٹک کینٹ۔ محمد وحید اسماعیل، لاہور۔ محمد بلال صدیقی، کراچی۔ ثمن رؤف، لاہور۔ محمد آصف، اسد محمد خان، میانوالی۔ محمد احسان، لاہور۔ محمد عبداللہ، واربرٹن۔ مصباح علی، حیدرآباد۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ مہر اکرم، لاہور۔ احمد جمشید، لاہور۔ منابل نسیم، اسلام آباد۔ اسامہ ظفر راجا، جہلم۔ محمد حنفا مغل، واہ کینٹ۔ بریرہ فاروق، گوجرانوالہ۔ ناصرہ مقدس، شرقپور۔ فتح محمد شارق، خوشاب۔ مسفرہ احسان، لاہور۔ ارینا آفتاب، کراچی۔ محمد وقاص، لاہور۔ فہد امین، گوجرانوالہ۔ سنبل ماہین، پنڈدادن خان۔ طوبیٰ راشد، لاہور۔ سعیدہ لیبہ آصف، لاہور۔ نور رضوان، پشاور۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ محمد عثمان، وزیرآباد۔ عتیق احمد، فیصل آباد۔ عاطف ممتاز، چکوال۔ عمارہ علی بجہ، لاہور۔ حدیٰ مریم، ڈیرہ اسماعیل خان۔ زاوش جدون، ایبٹ آباد۔ فجر نادر، سیال کوٹ۔ نمرہ افضل، وقاص افضل، جھنگ صدر۔ غسان عبداللہ، لاہور۔ دشمہ خان، لاہور۔ عبید اللہ ملک، اٹک۔ عرفہ عرفات، میانوالی۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ محمد سلال خان، ڈیرہ اسماعیل خان۔ مسفرہ عتیق، شیخوپورہ۔ سید نقیب الفضل ہاشمی، راول پنڈی۔ موسیٰ علی، نشاور۔ محمد زبیر، بہاول پور۔ محمد شاہد، لاہور۔ آصف، کراچی

آپ بھی

مسکرائیے

ایک نالائق شاگرد بار بار فیل ہوا۔ اُستاد نے تنگ آ کر کہا کہ ایک سوال کا جواب دے دو تاکہ میرا اور تمہارا ساتھ چھوٹ جائے اور تم اگلی کلاس میں چلے جاؤ۔
اُستاد: ''بتاؤ ہم سب کو کس نے پیدا کیا؟''
شاگرد: ''امی اسپتال والوں سے لے کر آئی تھیں۔''

☆

ایک آدمی (دوسرے آدمی سے): ''تمہارے گھر میں آگ لگ گئی ہے۔ جلدی جلدی چلو، بھاگو!''
دوسرا آدمی اطمینان سے بولا: ''مذاق نہ کرو، چابیاں تو میری جیب میں ہیں۔ گھر میں آگ کیسے لگ گئی؟!''
(عدن سجاد، جھنگ)

☆

اُستاد (شاگرد سے): ''یہ اپنے ساتھ کس شخص کو لائے ہو؟''
شاگرد: ''شرافت چوکیدار کو۔''
اُستاد: ''وہ کیوں؟''
شاگرد: ''آپ ہی نے تو کہا تھا کہ کل شرافت کے ساتھ اسکول آنا۔''
(مریم حسن، کراچی)

ایک بے وقوف (دوسرے سے): ''اگر تم بتا دو کہ میری جھولی میں کیا ہے تو یہ انڈے میں تمہیں دے دوں گا اور یہ بھی اگر بتا دو کہ کتنے انڈے ہیں تو بارہ کے بارہ تمہیں دے دوں گا۔''
دوسرا بے وقوف: ''یار! تم اتنے مشکل سوال پوچھ رہے ہو، مجھے تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا۔''
(مریم رضوان، کراچی)

بیوی: ''اگر میں مرگئی تو کیا کریں گے؟''
شوہر: ''اس صورت میں شاید میں بھی مر جاؤں گا۔''
بیوی (خوش ہو کر): ''وہ کیوں؟''
شوہر: ''کبھی کبھی آدمی خوشی سے بھی مر جاتا ہے۔''

☆

قرض خواہ (ملازم سے): ''تمہارے صاحب کب گھر ہوتے ہیں؟''
ملازم: ''آپ کے جانے کے بعد گھر ہی میں ہوتے ہیں۔''
(اقصیٰ، عائشہ، سعد، لاہور)

دادا: ''ایک زمانہ تھا جب جیب میں دس روپے ہوتے تھے تو گھی، چاول، دالیں سب کچھ لے آتا تھا۔''
پوتا: ''اب یہ فن کاریاں نہیں چلتی، دادا جی! اب وہاں کیمرے لگ گئے ہیں۔''
(محمد حنظلہ سعید، حسنہ حور، فیصل آباد)

ایک قصبے کے قریب کسی سرکاری باغ کے چاروں طرف خاردار تاروں کا جال بچھا دیا گیا اور اس میں برقی رو دوڑا دی گئی۔ اس تار کے ساتھ ایک بورڈ لگا دیا گیا جس پر لکھا تھا۔
''خطرہ 440 وولٹ! جو کوئی اس کو چھوئے گا فوراً فوت ہو جائے گا'' اس کے نیچے یہ الفاظ بھی لکھے گئے۔ ''خلاف ورزی کرنے والے کو ایک ہفتہ قید کی سزا سنائی جائے گی۔''
(محمد لقمان ڈھویا، گجرات)

بلدیاتی الیکشن کا ایک امیدوار فٹ بال میچ میں مہمان خصوصی بنا۔ میچ ختم ہونے پر اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ دونوں ٹیمیں ایک ہی فٹ بال کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ آپ مجھے ووٹ دیں، میں ہر کھلاڑی کو الگ الگ فٹ بال دوں گا۔''

☆

ایک پاگل (دوسرے سے): ''یار تم کل میرے جنازے میں کیوں نہیں آئے۔''
دوسرا پاگل: ''ارے خواہ مخواہ ناراض ہوتے ہو، میں کیسے آتا؟ کل ہی تو پیدا ہوا ہوں۔''
(محمد طلحہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

اسکول کے ایک ٹیسٹ میں بچوں کو کرکٹ میچ پر مضمون لکھنا تھا۔ ایک بچے نے صرف ایک منٹ میں مضمون ختم کر لیا اور کاپی ٹیچر کو دے کر رخصت ہو گیا۔ کاپی پر لکھا تھا:
''بارش کی وجہ سے میچ نہیں ہو سکا۔''

☆

مالی (بچے سے): ''تم درخت پر چڑھ کر کیا کر رہے ہو؟''
بچہ: ''کچھ نہیں! آپ کے آم نیچے گر گئے تھے، انہیں دوبارہ لٹکا رہا ہوں۔''
(ابرار الحق، حذیفہ، راجہ جنگ)

☆☆☆

فرمانِ حضرت علی کرم اللہ وجہہ

''اے کمیلؓ! یاد رکھو کہ علم مال سے بہتر ہے، کیوں کہ علم تمہاری نگہداشت کرتا ہے اور مال کی تمہیں نگہداشت کرنی پڑتی ہے اور مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے، لیکن علم صرف کرنے سے بڑھتا ہے۔ اے کمیلؓ! علم کی شناسائی ایک دین ہے کہ جس کی اقتدا کی جاتی ہے۔ اسی سے انسان اپنی زندگی میں دوسروں سے اپنی اطاعت منواتا ہے اور مرنے کے بعد نیک نامی حاصل کرتا ہے۔ یاد رکھو کہ علم حاکم ہوتا ہے اور مال محکوم۔'' (ماخوذ از نہج البلاغہ۔کلمات قصار)

(سید ذوالفقار حسین نقوی، کراچی)

دل چسپ وعجیب

کیا آپ جانتے ہیں کہ بحیرۂ مردار کو بحرِ مردار (Dead Sea) کیوں کہتے ہیں؟ اس لیے کہ اس میں نمک کی مقدار بہت زیادہ ہے اور کوئی جانور یا پودہ اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس میں نمکیات بے حد زیادہ ہیں اور سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ سردیوں میں درجہ حرارت میں کافی زیادہ کمی کی وجہ سے اس میں موجود نمک سے ہیرے (Diamond) بنتے ہیں۔

☆

یاد رکھنے کی باتیں

☆ احمق کے ساتھ مت رہو کیوں کہ یہ تمہیں فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے گا مگر ضرر پہنچائے گا۔

☆ بخیل سے تعلق مت رکھو، یہ اپنے تھوڑے نفع کی خاطر تمہارا بہت سا نقصان کر دے گا۔

☆ بزدل سے دوستی نہ کرو، یہ آڑے وقت میں تمہیں ہلاکت میں چھوڑ دے گا۔

☆ اللہ تعالیٰ کو دل اور زبان کی سختی پسند نہیں، اس لیے تو اللہ نے ان میں ہڈی نہیں بنائی۔ (مشیرہ سلیمان بٹ)

قائداعظمؒ کا جواب

تحریک پاکستان جاری تھی۔ ایک دن قائداعظم اپنی گاڑی میں پُرہجوم جگہ سے گزر رہے تھے کہ ایک ہندو لڑکے نے سوال کرنے کی اجازت مانگی۔ قائد نے گاڑی رُکوا دی اور اسے سوال کرنے کی اجازت دی۔ لڑکے نے پوچھا کہ مسٹر جناح آپ پاکستان کیوں بنانا چاہتے ہیں؟ قائداعظم نے اسے رُکنے کا اشارہ کیا اور پانی کا گلاس منگوایا۔ اس میں سے ایک گھونٹ پانی کا پی کر ہندو لڑکے سے کہا کہ باقی پانی تم پی لو۔ ہندو لڑکے نے منع کیا کہ میرا مذہب اس کی اجازت نہیں دیتا۔ تب قائداعظم نے ایک مسلمان لڑکے کو وہ گلاس دیا جو اس نے فوراً پی لیا۔ قائد نے ہندو لڑکے سے کہا کہ تمہارے سوال کا جواب یہی ہے جو تم نے پانی نہ پی کر دیا۔ (عالیہ احمد، راول پنڈی)

چڑیا گھر

بچو! یہ ہے چڑیا گھر
آؤ چلیں اس کے اندر
رنگ برنگے دیکھیں طوطے
کچھ ہنستے ہیں کچھ روتے
مور ہے ناچ دکھانے والا
سب سے انوکھا سب سے نرالا
بھالو ، چیتے ، بکری ، شیر
اُلّو بھی ہے اور بٹیر
بطخوں کی تیراکی دیکھو
بندر کی چالاکی دیکھو
ہاتھی اور زرافہ دیکھو
لومڑی بھی حرافہ دیکھو
گینڈا ، اونٹ ، دریائی گھوڑا
منہ ہے جس کا سب سے چوڑا
چیتا سب سے ہے پھرتیلا
رنگ ہے جس کا کالا ، پیلا
کچھوے ، سارس اور کبوتر
جانور سب ہیں اس کے اندر

(شریف احمد)

انسان

ایک دفعہ انسان نے کوئل سے کہا: ''اگر تو کالی نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔'' پھر سمندر سے کہا: ''اگر تو کھارا نہ ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔'' پھر گلاب سے کہا: ''اگر تجھ پر کانٹے نہ ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔''
پھر تینوں ایک ساتھ بولے: ''اے انسان! اگر تجھ میں دوسروں کے عیب ڈھونڈنے کی عادت نہ ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا۔''

(بلال سیفی، پل بجواں)

اچھی باتیں

☆ کردار ایک ایسا ہیرا ہے جو ہر پتھر کو کاٹ سکتا ہے۔
☆ نیک شخص کی دوستی سب سے بہتر ہے۔
☆ ندی اور آنکھ کے پانی میں صرف جذبات کا فرق ہے۔
☆ جب تک کھویا نہیں، تب تک پایا نہیں۔
☆ بولنا اگر چاندی ہے تو خاموش رہنا سونا۔ (آمنہ غفار، اسلام آباد)

انمول موتی

☆ نماز قائم کرو اس سے پہلے کہ تمہاری نماز پڑھی جائے۔
☆ کتنی مختصر دیر کے لیے ہم اس دُنیا میں آئے۔ آتے ہوئے اذان ہوئی اور جاتے ہوئے نماز۔
☆ توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو، ان کے دل نرم ہوتے ہیں۔
☆ جہاں دین و دُنیا کا مقابلہ ہو تو آخرت کو اختیار کرو کیوں کہ دُنیا فانی ہے۔
☆ جب کسی عالم کو دیکھو کہ وہ دُنیا کی زندگی سے محبت کرتا ہے تو اس کی دین کی باتوں پر اعتبار نہ کرو۔
☆ اگر پہاڑوں کو سر کرنے کا ارادہ ہے تو پہلے پتھروں کو سر کرنا سیکھو۔
☆ کسی کا عیب تلاش کرنے والے کی مثال اس مکھی کی طرح ہے جو سارا خوب صورت جسم چھوڑ کر ایک زخم پر بیٹھ جاتی ہے۔

(گوہر زمان، گوجرانوالہ)

تمنا

اگر تمنا حاصل سے زیادہ ہو تو اضطراب پیدا ہوگا اور انتشار ہوگا اور اگر حاصل تمنا سے زیادہ ہو تو سکون کا باعث بنے گا۔ کم آرزو والا انسان مطمئن رہتا ہے۔ (عائشہ ہاشمی، میانوالی)

بکھرے موتی

☆ دوسروں پر نگاہ ڈالنے سے پہلے خود کو ایک نظر دیکھ لو۔
☆ محبت دینا ہی بذاتِ خود تعلیم ہے۔
☆ سچ تو موجود ہوتا ہے صرف جھوٹ ایجاد کرنے پڑتے ہیں۔
☆ جب تک زندہ رہو، زندہ رہنا سیکھتے رہو۔
☆ جو پوچھنے سے ڈرتا ہے، وہ علم سے محروم رہتا ہے۔
☆ عیب و نقص والے دوسروں کے عیوب پھیلاتے ہیں تاکہ اپنے عیوب چھپا سکیں۔
☆ دولت سے ہم سخاوت تو خرید سکتے ہیں مگر عبادت نہیں۔
☆ نہ گرنا کمال نہیں بلکہ کمال یہ ہے کہ تم گرو اور پھر از سرِ نو کھڑے ہو جاؤ۔ (عظمیٰ اشفاق)

مہکتی کلیاں

☆ جب انسان بڑی دیواروں سے پھلانگنے کی کوشش کرتا ہے تو اکثر چھوٹی دیواروں سے بھی گر جاتا ہے۔
☆ دعا محض دو یا تین لفظوں کا ایک جملہ ہوتا ہے مگر اس سے انسان کی تقدیر بدل جاتی ہے۔
☆ انسان اتنا کچھ کام یابی سے سیکھ نہیں پاتا جتنا کہ ناکامی سے۔
☆ عقل مند انسان چیز کے معیار کو دیکھتا ہے نہ یہ کہ وہ پرانی ہے یا نئی۔ (کنزیٰ جدون، ایبٹ آباد)

سنہری باتیں

☆ کام یابی کا حصول اتنا اہم نہیں جتنا مقصد کا انتخاب ہے۔
☆ دُنیا میں موجود آدھا علم نصیحت کا علم ہے۔
☆ کام یابی ایک خوب صورت تتلی ہے جس کے تعاقب میں انسان بہت آگے نکل جاتا ہے۔ (محمد ابرار اشرف، سہروال کلاں)
☆ اپنی مسکراہٹ کسی کو دے دو، خوشی آپ کی ہو جائے گی۔
☆ گفتگو میں سب سے قیمتی چیز خاموشی کے وقفے ہیں۔
☆ دولت، رتبہ اور اختیار ملنے سے انسان کا اصلی چہرہ سامنے آ جاتا ہے۔
☆ مخلوق سے مانگنا ذلت ہے۔ دے تو احسان، نہ دے تو شرمندگی۔
☆ انسان وہی کرتا ہے جو وہ کر سکتا ہے جب کہ اللہ وہی کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ (اسد اللہ ممتاز حسنین، محمد بن ذوالفقار علی، فیصل آباد)

العظمت مارکیٹ میں خوب چہل پہل تھی مگر ایک بڑی سی دُکان سائیں سائیں کر رہی تھی جس کی پیشانی پر ایک بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا:

حکیم حاذق گنجے والا

ماہرِ طبِ مشرق و مغرب و شمال و جنوب

ماہرِ امراضِ بزرگان و جوان و بچگان

......اور دُکان کے اندر کھڑکھاند گروپ بیٹھا مکھیاں مار رہا تھا۔

دُکان میں ایک کرم خوردہ میز پڑی تھی جس کے پیچھے تین ٹانگوں والی ایک کرسی پڑی تھی۔ کرسی پر گنجے والا اداس اُلو کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ کرسی کی چوتھی ٹانگ کی کمی اینٹوں سے پوری کی گئی تھی۔ میز پر رنگ برنگی گولیوں اور کیپسولوں کے مرتبان سجے ہوئے تھے۔ میز کے سامنے جو کرسی پڑی تھی، وہ اگرچہ بظاہر ٹھیک ہی لگتی تھی تاہم کھڑکھاند گروپ کو معلوم تھا کہ اسے دیمک اس طرح چاٹ گئی تھی، جس طرح ٹی بی کا مرض، مریض کو اندر ہی اندر سے چاٹ جاتا ہے۔

ایک طرف ایک بنچ پڑا تھا، جس پر دادا بڈی، ملنگی اور مبارکاں بیٹھے مکھیاں مار رہے تھے اور ان کے قریب ہی ایک چھوٹی سی دری پر چھوٹے والا اپنی گُٹھالی سامنے لیے بیٹھا تھا۔ وہ کل سے پُھکیاں بنا رہا تھا۔

اچانک چھوٹے والے نے ایک طویل جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''میں تو پہلے بھی کہتا تھا کہ یہ کام کھڑکھاند گروپ کے بس کا نہیں، ارے لوگوں کو پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا کہ ہمارے پاس علاج کرانے آئیں گے۔''

''آئیں گے، ضرور آئیں گے۔ آج 'فیس بک' پر بھی ایڈ دیا ہے اور پھر آج تیسرا ہی تو دن ہے، گھبرانے کی کیا بات ہے؟''

''اگر کسی کو کچھ ہو گیا تو......؟'' دادا بڈی نے پریشان ہو کر کہا۔ ''اُلٹی آنتیں گلے نہ پڑ جائیں!''

''ارے جاؤ......'' ملنگی نے ایسے ہاتھ ہلایا جیسے ناک سے مکھی اُڑائی ہو۔ ''دیہاتوں میں سب چلتا ہے۔ اگر کوئی مریض ٹھیک ہو گیا تو ہماری بلے بلے ہو جائے گی۔ وہ ہماری پبلسٹی کرے گا اور وہ بھی مفت میں...... اور اگر معاملہ بگڑ گیا تو وہ اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر صبر کر لے گا۔''

''ارے تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے؟'' گنجے والا نے انہیں گھور کر دیکھا۔ ''میں نے چھے ماہ کا حکمت کا کورس بائی ڈاک کیا ہے اور ایک حکیم میرا دوست بھی ہے...... ناگنی والا...... اس نے مجھے حکمت کے بڑے گُر سکھائے ہیں۔''

ان سے پہلے کہ مزید کوئی بات ہوتی، مبارکاں اچانک چلا اُٹھا۔ ''مبارکاں مبارکاں...... پہلا مریض آ گیا۔''

سب خوشی سے اُچھل پڑے۔ دادا بڈی اور ملنگی نے اسے

تقریباً اُٹھا کر کرسی پر بٹھا دیا۔ اس نے اپنی ٹھوڑی پکڑی ہوئی تھی اور 'ہائے ہائے' کر رہا تھا۔

گنجے والا نے فوراً کہا۔ ''ایسا لگتا ہے، آپ کے دانت میں بہت تکلیف ہے۔''

مریض نے سر ہلایا۔ ''جی، حکیم صاحب...... رات کو نیند بھی نہیں آئی۔''

''فکر نہ کرو...... اب میں جانوں اور آپ کا دانت۔'' گنجے والا نے حکیمانہ انداز میں کہا۔ ''اب ذرا منہ کھولیں۔''

مریض نے تھوڑا سا منہ کھول دیا۔

گنجے والا نے ایک ٹارچ سے روشنی اس کے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑا اور منہ کھولیں۔''

''آ...... آ...... آ......'' مریض نے پورا منہ کھول دیا۔

گنجے والا نے کہا۔ ''تھوڑا اور......''

مریض نے بھنا کر کہا۔ ''آپ نے دانتوں کا معائنہ کرنا ہے...... یا میرے منہ میں بیٹھنا ہے؟''

کھڑ کھاند گروپ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ گنجے والا نے تلملا کر کہا۔ ''دانت نکالنا پڑے گا!''

''ارے نہیں...... وہ کیوں؟'' مریض کا رنگ اُڑ گیا۔ اس نے کرسی سے اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن دادا بڈی اور ملنگی نے اسے فوراً ہی کرسی پر جکڑ لیا۔

گنجے والا نے کہا۔ ''کیوں کہ تمہارے دانت میں کیڑا لگ گیا ہے...... مبارکاں! ذرا 'زنبور' دینا......''

مبارکاں نے فوراً ہی ایک پلاس نما اوزار گنجے والا کو پکڑا دیا۔

گنجے والا نے پھرتی سے زنبور اس کے نچلے جبڑے کے دانتوں پر رکھا...... تو مریض چلا اُٹھا۔ ''مگر درد تو اوپر والے دانت میں ہے، آپ نچلا دانت کیوں نکال رہے ہیں؟''

گنجے والا نے حکیمانہ انداز میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں بے وقوف! لیکن سوچو...... کیڑا اوپر والے دانت کو کیسے کھائے گا؟ ظاہر ہے، نیچے والے دانت پر بیٹھ کر ناں...... تو میں نچلا دانت ہی نکال دیتا ہوں تاکہ اس کے بیٹھنے کی جگہ ہی نہ رہے...... نہ رہے بانس، نہ بجے بانسری!''

''بلکہ نہ رہے دانت، نہ لگے کیڑا!'' دادا بڈی نے قہقہہ لگایا۔

اب مریض کو 200 فیصد یقین ہو چلا تھا کہ میں پاگلوں میں پھنس چکا ہوں۔ جونہی گنجے والا نے زنبور سے اس کا دانت پکڑنے کی کوشش کی، اس نے یک لخت زور لگایا اور دوسرے ہی لمحے کڑ...... کڑ...... کڑ...... کی آوازوں کے ساتھ ہی کرسی کے دو پائے ٹوٹ گئے اور وہ کرسی سمیت زمین بوس ہو گیا۔ دادا بڈی اور ملنگی بھی اپنی ہی جھونک میں دھڑام سے فرش پر گر پڑے۔ مریض نے کافی پھرتی دکھائی تھی اور اس سے پہلے کہ کھڑ کھاند گروپ اسے دوبارہ قابو کرتا، وہ ایسے بھاگا جیسے موت کا فرشتہ اس کا تعاقب کر رہا ہو۔

مبارکاں اور چھوٹے والا اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ گنجے والا ان پر بادل کی طرح برس پڑتا اور اپنی شرمندگی کو دھو ڈالتا، اچانک ایک اور مریض اندر داخل ہوا۔

''ہائے ہائے......'' اس نے اپنا پیٹ پکڑا ہوا تھا۔ ''کیا گنجے والا حکیم یہیں بیٹھتا ہے......؟''

کھڑ کھاند گروپ نے اس زور سے قہقہہ لگایا کہ یوں لگا جیسے دکان کی چھت ہی اُڑ جائے گی۔

''بدتمیز...... جاہل......'' گنجے والا بڑبڑایا، پھر وہ مریض سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کو کیا تکلیف ہے؟'' انداز ایسا ہی تھا، جیسے کچا چبا جائے گا۔

''جی حکیم چندے والا صاحب...... کل سے پیٹ میں بہت درد ہے...... کھانا بھی عام سا کھایا ہے۔'' مریض کافی باتونی تھا اور اسے نام بگاڑنے میں کمال حاصل تھا۔

''ہوں...... سوچنا پڑے گا۔'' گنجے والا نے ہنکارہ بھرا۔

''جلدی کچھ کیجیے جناب گندے والا...... میں مر رہا ہوں۔'' مریض نے ایک نیا لقب دیتے ہوئے کہا۔

گنجے والا نے غصے سے کہا۔ ''ساری کارستانی جراثیم کی ہے، جراثیم کو مارنا ضروری ہے۔''

''مگر کیسے......؟ وہ تو نظر بھی نہیں آتے۔'' مریض نے حیران ہو کر کہا۔

''جراثیم کو مارنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔'' گنجے والا نے چٹکی بجائی۔ ''ارے مبارکاں...... چھوٹے والا...... ذرا وہ کونے سے سپرے مشین اُٹھانا۔''

چھوٹے والا نے حیران ہو کر کہا۔ ''مگر وہ تو فصلوں پر سپرے

کرنے والی مشین ہے۔"

"ارے بیوقوف! جب وہ 'امریکن سنڈی' کو نہیں چھوڑتی تو ننھے منے جراثیم کو کیسے چھوڑے گی؟"

چھوٹے والا اور مبارکاں سپرے مشین لے کر آ گئے۔ مریض کو دادا بڈی اور ملنگی نے پکڑ لیا۔ مبارکاں نے پمپ مارا اور چھوٹے والا نے نوزل مریض کی طرف کر دی۔ مریض نے ایک بھیانک چیخ ماری تو چھوٹے والا بوکھلا گیا۔ اس کا ہاتھ بہکا اور سپرے سیدھا دادا بڈی کے چہرے پر پڑا۔

دادا بڈی نے ایک دل خراش چیخ ماری اور 'مار ڈالا چھوٹے والا کے بچے!' کہتا ہوا کمرے میں ناچنے لگا۔ چھوٹے والا مزید بوکھلا گیا اور نوزل کا رخ ملنگی کی طرف ہو گیا۔ وہ مریض کو چھوڑ کر بھاگا تو گنجے والا سے ٹکرایا اور وہ دونوں دھڑام سے فرش پر گر پڑے۔ اگلے ہی لمحے مریض دُکان سے باہر تھا۔

دادا بڈی نے دس بار منہ دھویا تو تب کہیں آنکھوں کی جلن دُور ہوئی لیکن اس کی آنکھیں خونِ کبوتر کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔

گنجے والا نے کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا۔ "آج مشکل سے دو مریض ہتھے چڑھے تھے، وہ بھی آپ لوگوں کی نالائقی کی وجہ سے بچ نکلے۔"

نکلنے نہ پائے۔"

"بلکہ فیس ایڈوانس لے لیں گے۔" چھوٹے والا نے مشورہ دیا۔

اتنی دیر میں نوجوان ایک عدد مریل گدھے کے ہمراہ اندر داخل ہوا۔ گنجے والا کا پارہ چڑھ گیا۔ "احمق...... اسے اندر کیوں لے آئے ہو......؟ اسے باہر باندھو اور مریض کو اندر لاؤ۔"

"جنابِ عالی......" نوجوان نے ادب سے کہا۔ "یہی مریض ہے!"

"کک...... کیا...... یہی...... مم...... مریض ہے۔" گنجے والا غصے کی شدت سے ہکلا گیا۔ "میں تمہیں جانوروں کا ڈاکٹر نظر آتا ہوں؟"

"باہر تو یہی لکھا ہوا ہے...... ماہرِ امراضِ بزرگان وحیوان......" نوجوان نے اطمینان سے جواب دیا اور گنجے والا نے بے بسی سے اپنا سر پیٹ لیا۔ "ارے بے وقوف...... وہ ماہرِ امراضِ جوان لکھا ہوا ہے...... حیوان نہیں۔"

"اوہ...... آئی سی...... جناب کچھ تو کریں...... کل سے اس نے کھایا پیا کچھ نہیں۔" نوجوان نے لجاجت سے کہا۔

"ہرگز نہیں......" گنجے والا دھاڑا۔

"آپ تو خواہ مخواہ غصے ہو رہے ہیں حکیم صاحب...... اسے اپنا بھائی بھرا ہی سمجھ کر علاج کر دیں۔" نوجوان نے منت کی اور

اس سے پہلے کہ کھڑ کھاند گروپ اپنی صفائی پیش کرتا، اچانک ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ "حکیم صاحب موجود ہیں؟" اس نے نہایت خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"جی...... جی...... موجود ہیں۔" دادا بڈی نے چہک کر کہا۔ کھڑ کھاند گروپ کے چہرے کھل اُٹھے۔

"مبارکاں مبارکاں...... ایک مریض پھر آ گیا۔" مبارکاں نے کہا۔ "لیکن دوستو! اسے پکا قابو کرنا ہے، فیس دیے بغیر

کھڑ کھاند گروپ نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

گنجے والا کا غصہ عروج پر پہنچ گیا۔ ''بھائی ہوگا تمہارا...... میں تمہیں گدھا نظر آتا ہوں؟''

''نن...... نہیں...... نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' نوجوان بوکھلا گیا۔ ''لیکن اب دیکھیے ناں...... آپ کے سر پر بھی سینگ تو نہیں ہیں ناں۔'' گنجے والا نے سوچا کہ اگر کچھ دیر اور مکالمہ جاری رہا تو یہ نوجوان پتہ نہیں اور کس کس جانور سے ''برادری'' جوڑ دے...... لہٰذا بہتری اسی میں ہے کہ چپ چاپ گدھے کا علاج تجویز کر کے اسے دفع کر دے۔ چنانچہ اس نے اپنے غصے کو بے بسی سے پیتے ہوئے گدھے کا جائزہ لیا۔ یہ ایک درمیانے قد کا مریل سا گدھا تھا، جو سر جھکائے بڑی فرمانبرداری سے کھڑا تھا۔ گنجے والا نے ملنگی سے کہا۔ ''ذرا وہ لال رنگ کا ٹیکا دینا، لگتا ہے اسے ملیریا ہو گیا ہے۔'' یہ کہہ کر گنجے والا نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہاتھ پھیرتے ہی گدھے کے کان کھڑے ہو گئے۔ ملنگی انجکشن لایا تو سارا کھڑ کھاند گروپ تماشا دیکھنے کے لیے قریب آ گیا۔ گدھے کی آنکھیں سرچ لائیٹ کی طرح حلقوں میں گردش کرنے لگیں۔ گنجے والا نے نوجوان سے کہا۔ ''ذرا مضبوطی سے پکڑنا، میں ٹیکا لگانے لگا ہوں۔''

نوجوان نے رسی کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''بے فکر رہیں جناب...... یہ دو ٹانگوں والے گدھوں سے زیادہ بے ضرر ہے۔''

گنجے والا نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ گدھے نے بے چین ہو کر زور سے دم ہلائی، جو دادا بڈی کی آنکھوں میں لگی اور وہ ایک عدد خوفناک چیخ مار کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ گنجے والا نے حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے جلدی سے سوئی گدھے کی گردن میں گھسیڑ دی۔ گدھے نے تڑپ کر دولتی چلائی۔ پہلا نشانہ مبارکاں بنا، جو تماشا دیکھنے کے شوق میں بالکل قریب آ چکا تھا۔ گدھے کی ٹانگیں اس کی ران پر پڑیں اور وہ چیختا ہوا آٹے کی بوری کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا نشانہ چھوٹے والا بنا، اس نے ایک دل دوز چیخ ماری اور پیٹ کو پکڑے کونے میں جا گرا۔ رسی نوجوان کے ہاتھ سے چھوٹ چکی تھی اور اب گدھا آزاد تھا۔

ملنگی نے بھاگ کر میز کے پیچھے پناہ لی۔ گنجے والا بھی ادھر ہی بھاگا، کیوں کہ یہی ایک جائے پناہ بچی تھی لیکن گدھا بڑا تیز نکلا۔ اس

روزہ رکھنے کی نیت

وَ بِصَوْمِ غَدٍ نَّوَیْتُ مِنْ شَھْرِ رَمَضَانَ

اور میں نے ماہِ رمضان کے کل کے روزے کی نیت کی۔

روزہ کھولنے کی نیت

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ لَکَ صُمْتُ وَبِکَ اٰمَنْتُ وَعَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ

الٰہی میں نے تیرے لیے روزہ رکھا اور تجھ پر ایمان لایا اور تجھ پر بھروسا رکھا اور تیرے رزق پر افطار کیا۔

نے گھوم کر ایک بار پھر دولتی جھاڑی اور گنجے والا ڈکراتا ہوا میز پر جا گرا۔ کرم خوردہ میز یہ جھٹکا برداشت نہ کر سکی اور ٹوٹ کر بکھر گئی۔ میز کے ملبے کے نیچے سے ملنگی کی گھٹی گھٹی چیخیں ہی برآمد ہوئی تھیں۔ دواؤں کے مرتبان فرش پر گر کر ٹوٹ چکے تھے اور نیلے پیلے کیپسول اور گولیاں ''تجریدی آرٹ'' کا شاہ کار پیش کر رہی تھیں۔

دادا بڈی پتا نہیں کس کونے میں پڑا تھا۔ گدھے نے دو، تین بار ہوا میں ٹانگیں چلائیں اور جب اسے یقین ہو گیا کہ 'دشمن' میدانِ جنگ چھوڑ چکا ہے تو اس نے اپنا منہ بلند کر کے فاتحانہ انداز میں زور سے ''ڈھینچوں...... ڈھینچوں'' کا نعرہ بلند کیا اور باہر بھاگ نکلا۔

جب کھڑ کھاند گروپ کے حواس کچھ بحال ہوئے تو ملنگی کو نیچے سے نکالا گیا۔ اسے بھی کافی چوٹیں آئی تھیں۔ دادا بڈی یہاں جیت گیا تھا، کیوں کہ اس کے حصے میں صرف ایک دُم ہی آئی تھی۔ دُکان کا کباڑہ نکل چکا تھا......!!!

دادا بڈی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''افسوس کہ ہم اس گدھے کو جانتے بھی نہ تھے ورنہ کم از کم نقصان تو پورا کرا لیتے۔'' اس نے گدھے والے کو بھی گدھا بنا دیا تھا۔

گنجے والا نے کراہتے ہوئے اپنے ماتھے سے خون صاف کیا اور کہا۔ ''شکر کرو کہ جان بچ گئی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اس کے جسم میں مبارکاں جیسی کوئی خبیث بدروح تھی۔ دیکھا نہیں، کتنا مریل سا تھا اور دولتیاں ایسے مارتا تھا کہ خدا کی پناہ......!''

چھوٹے والا ابھی تک پیٹ پکڑے لیٹا ہوا تھا۔ اس نے رونے والے انداز میں کہا۔ ''ارے مجھے کیا ہو گیا؟ ظالم نے ایسی لات ماری ہے کہ مجھے لگتا ہے، معدے میں سوراخ ہو گیا ہے۔''

''فکر نہ کرو، آپ کا معدہ ویسے بھی 100 جی بی کا ہے۔ پندرہ، بیس جی بی کم ہو گیا تو بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔'' گنجے والا نے بے ساختہ کہا اور کھڑ کھاند گروپ اس حال میں بھی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ☆☆☆

حضرت بلالؓ بن رباح

رسولِ خدا کے مشہور صحابی، سچے عاشقِ رسول اور اسلام کے پہلے مؤذن جن کا شمار سابقین اسلام میں ہوتا ہے۔ آپؓ حبشی النسل تھے۔ آپؓ پہلے ایک یہودی کے غلام تھے لیکن جب سے آپؓ نے رسولِ کریمؐ کا ذکر سنا تو بروقت آپؐ ہی کا کلمہ پڑھنے لگے تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد ان کے مالک اُمیہ بن خلف نے ان کو سخت تکلیفیں دیں۔ وہ یہودی آنحضورؐ سے سخت نالاں تھا، اس لیے پہلے تو حضرت بلالؓ کو منع کرتا رہا۔ جب نہ مانے تو اس نے سختی کی، پھر بھی نہ مانے تو کم بخت سخت ظلم کرنے لگا۔ آپؓ کو جلتی ہوئی ریت پر لٹا دیتا اور بھاری پتھر رکھ دیتا تھا۔ آنحضرتؐ سے حضرت بلالؓ کی محبت یہودی کے ظلم کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔ ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ کا گزر ادھر سے ہوا۔ دیکھا کہ ایک حبشی غلام گرم ریت پر پڑا ہوا کراہ رہا ہے اور نام محمدﷺ اس کی زبان پر جاری ہے۔ آپؓ بے اختیار ان کی طرف دوڑے اور سارا حال معلوم کر کے آخرکار انہیں یہودی سے خرید لیا۔ پھر خدمت رسول اللہ میں حاضر ہو کر کہنے لگے کہ آپؐ کے لیے ایک غلام لایا ہوں، اسے قبول فرمایئے۔ آپؐ نے انہی نہایت محبت سے اپنے پاس رکھا۔ حضرت بلالؓ کو آپؐ سے ایسی محبت ہوئی کہ کسی وقت بھی حضور پاکؐ سے جدا نہ ہوتے تھے۔ جب آنحضرتؐ نے نماز سے قبل اذان دینے کا طریقہ پسند فرمایا تو حضرت بلالؓ اذان دینے پر مامور ہوئے کیوں کہ آپؓ کی آواز بڑی پرسوز اور بلند تھی جس وقت آپؓ اشہدان محمد رسول اللہ کہتے تھے تو حضرتؐ کی طرف انگلی سے اشارہ کر دیا کرتے تھے۔

جب رسول کریمؐ کی وفات ہوگئی تو حضرت بلالؓ اپنے ملک واپس چلے گئے اور وہاں پریشانی میں زندگی بسر کرنے لگے۔ ایک دن خواب میں جناب رسول پاکؐ کو دیکھا۔ آپؐ فرما رہے تھے۔ ''اے بلالؓ! تو نے میرا وطن کس لیے چھوڑا ہے، تو یہاں سے پھر مدینے چلا جا اور اپنی چند روزہ زندگی وہیں بسر کر۔'' جب آپؓ خواب سے اُٹھے تو محبوب کی یاد ستانے لگی۔ مدینے کی گلیاں اور اذان دینے کا مینار آپؓ کی نظروں کے سامنے گھومنے لگا اور آپؓ دیوانہ وار مدینہ منورہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ ایک دن نبیؐ کے نواسوں نے مجبور کیا کہ حضرت بلالؓ مسجدِ نبویؐ میں چل کر اذان سنائیں۔ جب اصرار بڑھ گیا تو آپؓ مسجدِ نبویؐ میں اذان کہنے کے لیے تشریف لائے۔ مدینہ منورہ میں لوگوں کی بھیڑ لگ گئی اور مسجدِ نبویؐ میں عجیب عالم چھا گیا۔

ہجرت کے بعد انہوں نے تمام غزوات میں شرکت کی اور جنگِ بدر میں اپنے قدیم مالک اُمیہ بن خلف کو ہلاک کر دیا۔ آپؓ رسولِ خدا کے خادمان خاص میں سے تھے۔ جب آنحضرتؐ باہر نکلتے تو بلالؓ ان کا عصا پکڑ کر آگے آگے چلتے اور سفر میں ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی کرتے تھے۔ رسول اکرمؐ کی وفات کے بعد آپؓ نے شام کی جنگ میں شرکت کی اور وہیں حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں دمشق میں انتقال کیا۔

کھوج لگایئے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 / جون 2015ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 / جون 2015ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

جون کا موضوع ''انتظار کا وقت'' ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 / جون 2015ء ہے۔

نام ________ عمر ________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ________ شہر ________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________
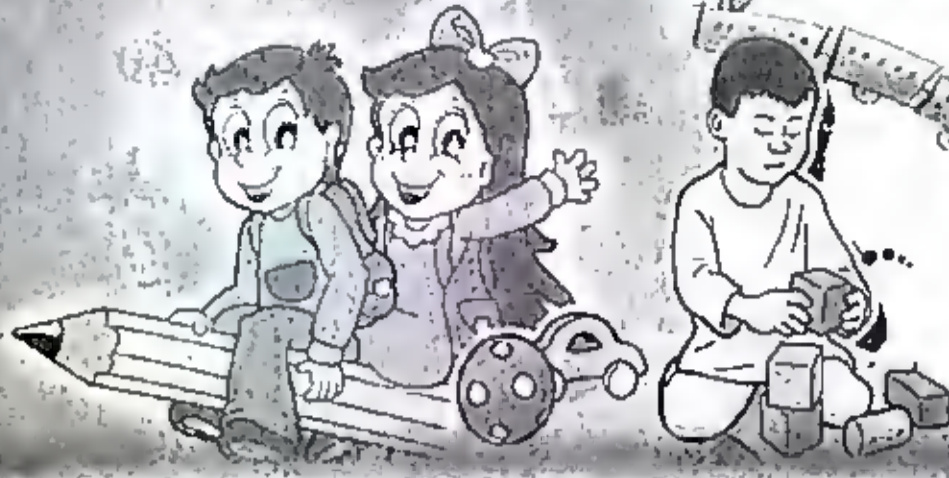
ش	ط	د	ب	ت	ک	م	ز	ء	ت
ب	ک	ی	ہ	ش	ع	ف	ڑ	ج	م
م	س	ا	ح	ت	ر	ا	م	ل	د
ع	ت	ر	م	ل	س	ض	پ	گ	خ
م	ق	و	ح	ک	چ	ظ	گ	ف	ز
و	ف	م	ن	ف	و	ر	ص	م	ط
ل	ش	ہ	ت	ع	ب	غ	ث	ش	ژ
ص	ز	ڈ	ث	س	ا	م	ع	ی	ن
ن	ق	ء	ن	پ	چ	ب	خ	ذ	ے
ت	ل	ق	ی	ن	ش	غ	ر	خ	ٹ

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اُوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

احترام، خدمت، تلقین، محنت، سامعین، مکتب، مصروف، شفقت، بچپن، معمول

گھر پر خوش حالی اور رزق کی فراوانی تھی لیکن صفائی ستھرائی اور سلیقہ جیسی خوبیوں کی تنگی تھی۔ چودہ سالہ جوان بیٹی گلاب کا مہکتا پھول تھی جس کی مسحور کن خوشبو نے اندر باہر کے سارے گند پر ایک پردہ سا ڈال دیا تھا۔

چائے سے فارغ ہو کر میں نے چارپائی کی پٹی سے نیچے لٹکتی ٹانگوں کو اوپر کیا۔ دیوار سے ٹیک لگائی اور اپنے میزبان کی طرف دیکھا جو مقامی ٹوپی سر سے اتارے اپنے خشخشی بالوں میں انگلیاں چلا رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں تھوڑا سا آرام کرلوں۔

مجھے آرام کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ان سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ شہر کے مضافات میں گھومنے کی متمنی تھی۔ صاحب خانہ نے اپنی پٹولہ سی حسین بیوی پر ایک نظر ڈالی۔ پھر نگاہوں کا رخ میری سمت کیا اور بولے۔

''آپ کو یقیناً یہ تو پتا چل گیا ہوگا کہ شنا یہاں کے اکثریتی لوگوں کی زبان ہے۔ شنا بولنے والے لوگ دراصل دارد یا دُرد ہیں اور نسلاً آریائی ہیں۔ آریا قوم دس پندرہ صدی قبل از مسیح وادی سندھ میں فاتح بن کر آئی۔ انہوں نے ''جلکوٹ اور گور'' کے درمیانی علاقے میں رہنا شروع کیا۔ ان کا وہ گروہ جو اپنے طور طریقوں، رسم ورواج پر قائم رہا ''شین'' کہلایا لیکن وہ لوگ جو ارد گرد پھیل گئے اور جنہوں نے مقامی لوگوں سے شادیاں کیں۔ اپنا رنگ انہیں دیا اور کچھ ان کا رنگ خود لیا، کمی اور ڈوم کم تر ذاتیں ہیں۔ شین اس علاقے کی سب سے اونچی اور ممتاز قوم ہے۔ ہم دونوں شین ہیں۔'' انہوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور آنکھوں سے بیوی کی طرف اشارہ کیا۔

صاحب خانہ نے آخری جملہ گو دھیمے انداز میں کہا تھا لیکن اس میں تفاخر کی جو لہریں موجیں مار رہی تھیں، وہ مجھ سے چھپی نہ رہی تھیں۔

باہر کوئی ملنے والا آیا تھا۔ میرے میزبان اُٹھ کر چلے گئے۔

میں کمرے سے نکل کر آنگن میں آئی۔ دھوپ کی تیزی اور اس کا پیار پہاڑوں اور میدانوں پر بھری دوپہر کی مانند تھا لیکن ابھی صبح تھی اور میری گھڑی نو بجا رہی تھی۔

برآمدے کی دیوار کے ساتھ لوہے کے چولہے میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ یہ چولہا عجیب ساخت کا تھا۔ آگے پیچھے کا سلسلہ یوں پھیلا ہوا تھا کہ چولہے کے منہ میں جلتی لکڑیوں کی آگ تیسری دیگچی تک پہنچ رہی تھی۔ پتیلیوں اور دیگچی میں جانے کیا کیا پک رہا تھا؟

میں قریب جا بیٹھی۔ گلاب کے پھول نے ہنستی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ میں نے نام پوچھا۔ ''گل جان بیگم۔''

ایسی معصوم اور بھولی بھالی صورت کے لیے کیسا بھاری بھرکم نام تھا۔ میں کھڑی ہوگئی کیوں کہ گل جان بیگم نے مجھے پیش کش کی تھی کہ آؤ تمہیں اپنا باغیچہ دکھاؤں۔

نشست گاہ کے دروازے سے اتارا گیا دس پوڑوں کا چھوٹا سا چوبی زینہ گھر اور باغیچے میں رابطے کا واحد ذریعہ تھا۔ ناشپاتی، سیب، خوبانی کے درختوں کی ٹہنیاں اور انگور کی بیلیں پھولوں کے بار سے جھکی پڑتی تھیں۔ اس دلفریب نظارے کو دیکھ کر میرے چہرے اور آنکھوں سے خوشی کی کرنیں پھوٹی تھیں کیوں کہ میدانی علاقوں میں رہنے کی وجہ سے ہم لوگ تو قدرت کے ان انمول عطیات کو ان کے حسن کے ساتھ دیکھنے کی سعادت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

میری قسمت کہ میرے ذہن و دہن کو للچاتا پھل ابھی کچا تھا۔ پکا پھل توت ختم ہو چکا تھا۔ اگر کہیں کوئی ٹانواں ٹانواں دانا نظر آتا تھا تو اسے توڑنے کے لیے یقیناً میں لولی لنگی ہونے کا رسک لینا نہیں چاہتی تھی۔ سوانچل (ساگ) اور منڈیا (چائنا پالک) کی کیاریوں میں ابھی گل جان نے پاؤں دھرا ہی تھا جب اس کی پکار پڑی۔ وہ اور اس کے پیچھے پیچھے میں بھی الٹے پاؤں بھاگی۔ پتا چلا کہ گوشت تیز آنچ سے جل گیا ہے۔

میں اب چلاس کے گرد و نواح کا چکر لگانے اور قبل از تاریخ وہ چٹانی مجسمے اور پتھروں کے ہتھیار دیکھنے کا سوچ رہی تھی جن کی وجہ سے چلاس خصوصی اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

''ابھی باہر میرا بھتیجا آیا تھا۔ اسے میں نے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ ابھی آ رہا ہے۔ اس کے ساتھ چلاس کے مضافات میں گھوم آیئے۔ باقی رہے تاریخی مجسمے، دراصل یہ مختلف جگہوں پر ہیں۔ دریا پار ایک وادی تھلپن ہے۔ تھور اور گچی میں بھی سننے میں آئے ہیں۔ میں دراصل تذبذب میں ہوں کہ وہاں جانا مسئلہ ہے۔''

ان تاریخی کتبوں کو دیکھے بغیر چلاس آنا رائیگاں جاتا تھا۔ میں چارپائی پر بیٹھ گئی اور رسان سے بولی۔

''آپ میری مجبوری سمجھیں۔ کسی اچھی سی گاڑی اور ماہر ڈرائیور کا بندوبست کر دیجیے۔ جتنے پیسے وہ لینا چاہے، میں دوں گی۔ اچھا برا لگنے کی بات چھوڑیے۔ بچوں والی عورت کے لیے بار بار گھر سے نکلنا مشکل ہے۔ روز روز کوئی آیا جاتا ہے!''

پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔

سترہ اٹھارہ سال کا ایک لڑکا گھر میں داخل ہوا۔ یہ محمد صادق تھا جس نے گائیڈ کے فرائض سرانجام دیے تھے۔ میں اُٹھنے ہی والی تھی کہ برآمدے میں کھڑی گل جان نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ دہلیز سے قدم نکلتے ہی اس نے مجھے ہاتھ سے تھام کر دوسرے کمرے میں ایک جستی ٹرنک کے سامنے لا کھڑا کیا۔ میں حیران و ششدر ''سر آرتھر کونن ڈائل'' کی جاسوسی کہانیوں والی صورت حال محسوس کرتی تھی۔

تب ایک جھٹکے سے بکس کا ڈھکن اوپر اُٹھا۔ اس نے جرسی کی پھول دار چادر کپڑوں کی تہوں سے نکال کر اسے بند کیا۔ میرے سر سے وہ نسبتاً مہین چادر اتاری اور وہ اوڑھا دی۔

ریاض گلی سے جو چڑھائی شروع ہوئی تو وہ کھتر محلہ جا کر ختم ہوئی۔ پتھروں کی دیواروں والے گھر جن کے چھوٹے چھوٹے دروازے بند تھے جولائی کے تپتے سورج نے مجھے پسینہ پسینہ کر ڈالا تھا۔ ایک دیوار کی اوٹ میں ستانے بیٹھی تو صادق ہنسنے لگا۔

میرے دائیں بائیں اور سامنے جانوروں کی بکھری ہڈیاں ہر جاندار کے فانی ہونے کی داستانیں سنانے ہی لگی تھیں کہ میں دہلا کر اُٹھی۔ ان کہانیوں کو سننے کا ابھی میرے پاس وقت نہیں تھا۔

دیامر 1947ء میں گلگت پاکستان کا حصہ بنا۔ جنگ آزادی گلگت و بلتستان میں چلاسیوں اور استوریوں نے جی جان سے مجاہدوں کی نہ صرف مدد کی بلکہ عملی طور پر جنگ میں حصہ بھی لیا۔ 1953ء میں پورے داریل و تانگیر کا الحاق دیامر کے ساتھ ہوا۔ 1972ء میں انتظامی بہتری کے لیے استوار، داریل و تانگیر اور چلاس کی تحصیلوں کو ملا کر ایک ضلع دیامر کے نام سے قائم کیا گیا جس کا صدر مقام چلاس ہے۔

تھوڑی سی چڑھائی کے بعد میرے سامنے ایک پختہ سڑک تھی جس کے دونوں جانب بڑے بڑے دروازوں والی پختہ دکانیں تھیں۔ گاہکوں اور دکان داروں کی اکثریت باریش تھی۔ دلوں کے حال خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ سنت نبوی سے وابستگی کی بنا پر ہے یا اس میں خط بنوانے کی کاہلی کا عمل دخل ہے۔ چلاس کی اٹھانوے فیصد آبادی سنّی مسلک سے متعلق ہے۔

پرلی طرف چلاس کی تیسری آبادی جسے مہاجر کالونی کے ساتھ ساتھ رونئی بھی کہا جاتا ہے، واقع ہے۔ گھروں کی تعمیر کا سلسلہ جاری تھا۔ یہاں سرکاری ملازمین اور پٹھانوں کی اکثریت ہے۔ ستر اسّی گھر ہوں گے۔ ساتھ ہی شلکٹ کا گاؤں ہے۔

محمد صادق مجھے مچھلیوں کے فارم دیکھنے کی دعوت دے رہا تھا جو کہیں قریب ہی تھا لیکن مجھے زندوں کی نسبت بے جانوں سے زیادہ دل چسپی تھی۔ میں نے چلاس کا تاریخی قلعہ دیکھنے کے لیے

دوڑ لگا رکھی تھی۔

میں نے برجیوں میں سے جھانکتے ان سوراخوں کو دیکھا جن کے دہانوں پر رکھی گئی بندوقوں کی نالیوں سے شعلے نکل کر دشمن کو خاکستر کرتے تھے۔ چلاس کے جری و دلیر اور غیور لوگ ہمیشہ دشمن کے لیے عذاب بنے رہے۔

یہ 1851ء کا ذکر ہے۔ ڈوگرہ فوج نے چلاس پر حملہ کر دیا۔ ڈوگرہ فوج کیل کانٹے سے لیس ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے نامور فوجی اور سول راہنماؤں کے ساتھ تھی۔ وزیر زور آور سنگھ، دیوان ٹھاکر سنگھ، کرنل بجے سنگھ اور کرنل جواہر کے ہمراہ خود آئے تھے۔ اہلِ چلاس کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ لوگ اپنے اس قلعے میں آ گئے۔ یہ قلعہ ایسا مضبوط ایسا مستحکم اور ایسا پُراسرار تھا کہ کسی طرف سے بھی اس پر حملہ کرنے کی راہ نہ تھی۔ ڈوگرہ فوج اس کے چاروں طرف پھیل گئی۔ چلاسی مردوں کی شجاعت تو ایک طرف عورتیں ایسی جنگجو کہ انہوں نے بندوقیں ہاتھوں میں تھام کر مردوں سے کہا:

''تم لوگ رات کو لڑو، دن ہمارے لیے رہنے دو۔''

اب کرنل بجے اور جواہر سنگھ حیران کہ قلعے میں محصور لوگ کیا فولادی ہیں کہ تھکتے نہیں۔ کسی وقت تفنگ بازی کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا تھا۔ مخبروں نے خبر دی کہ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ لڑ رہی ہیں۔ جونہی ڈوگروں کی تازہ کمک پہنچتی فصیل سے گولیوں اور پتھروں کی ایسی بارش ہوتی کہ سپاہیوں کی اکثریت وہیں ڈھیر ہو جاتی۔

صورت حال تشویش ناک تھی۔ آخرکار قلعے کے اندر نقب لگا کر پانی کے حوض تک رسائی حاصل کی گئی اور پانی ضائع کر دیا۔ باہمت چلاسی اب مجبور ہو گئے تھے۔ اطاعت تو قبول کی، خراج ادا کرنا بھی منظور کیا لیکن اس کے باوجود 1892ء تک ڈوگرہ فوج کو باقاعدہ انتظامیہ قائم کرنی نصیب نہ ہوئی۔

اسی سال انگریزی فوج کے میجر رابرٹسن نے چلاس پر حملہ کیا۔ زبردست جھڑپوں کے بعد افواج کشمیر نے اس علاقے پر قبضہ کر لیا لیکن چلاس والوں نے اپنے اندرونی معاملات میں انہیں مداخلت کرنے کی کبھی اجازت نہ دی۔ ہمیشہ ان کے لیے مصیبت بنے رہے۔

جنگ آزادی کے لیے اہل چلاس کی خدمات نے بھی تاریخ کے صفحات میں سنہری ابواب کا اضافہ کیا۔ ٹائیگر فورس جس کی قلندرانہ آن میں سکندرانہ شان تھی اس میں چلاس کے جیالے بھی شامل تھے جو ہر محاذ پر بے جگری سے لڑے اور شجاعت کے میدان میں نئی داستانیں رقم کیں۔

جب واپسی کے لیے ڈھلانی راستے پر تیزی سے اترا جا رہا تھا۔ میں ایک جگہ بے اختیار رک گئی۔ میرے سامنے ایک ایسا گھر تھا جس کی دیواریں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ آنگن میں جابجا کوڑا کرکٹ بکھرا ہوا تھا شکستہ دیوار کی چھوٹی سی اوٹ میں ایک نحیف و نزار بوڑھا فراغت کا مرحلہ طے کر رہا تھا۔ خوبانی کے پیڑ کے نیچے بچھی چارپائی پر ایک ایسی لڑکی تھی جو اس ماحول کی مناسبت سے مجھے کنول کا پھول نظر آئی تھی۔ درخت کے تنے سے بندھی بکری تصویر حیرت بنی اس ماحول کو دیکھتی اور کبھی کبھی بھاں بھاں کرتی تھی۔

میں بے اختیار اس کے پاس جا بیٹھی۔ سامنے کا منظر کیسا بلفریب تھا۔ دریائے سندھ ایک پتلی سی لکیر کی مانند نظر آ رہا تھا۔ سہاگے کیے ہوئے اور سبز کونپلوں والے چھوٹے بڑے کھیت جیومیٹری کی ہر شکل کا نمونہ تھے۔ چلاس کی زرخیز میدانی زمین دو فصلی ہونے کے باوجود غذائی ضروریات میں لوگوں کو خودکفیل نہیں کرتی۔

شاہ بلوط کے قد آور درختوں کے پتے ہوا کے زور سے جھوم کر جب سورج کے رخ پر آتے تو یوں لگتا جیسے چاندی کے دریا میں غوطہ مار کر نکلے ہوں۔ دریا پار کھنر کے پہاڑ تھے۔ ننگے بچے یہ پہاڑ ذرا جاذب نظر نہ تھے۔

صادق نے شنا (مقامی زبان) میں اسے غالباً میرے متعلق بتایا تھا۔ گرمی کی اس شدت میں اس نے نیلی پھولوں والی جرسی کا گندہ مندہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ گلے میں کپڑے پر لگائے گئے موتیوں کا زیور جسے وہ مشٹی کہتی تھی، زیب تن تھا۔ اس کی صحت، حسن و جوانی اور بانکپن کو دیکھتے ہوئے میرا یہ سوال فطری تھا۔

''اتنا گند پھیلائے بیٹھی ہو؟ طبیعت نہیں گھبراتی۔''

اس ماہ رخ نے کمال بے اعتنائی سے ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا تھا۔

''دراصل پرسوں تو ہم لوگوں نے گونِل جانا ہے۔ وہاں ہمارا گھر، زمین، بھیڑ بکریاں، مال مویشی، دیار، دیودار اور چلغوزوں کے درخت ہیں۔ جب جانا ہے تو فضول میں یہاں ہلکان ہونے سے فائدہ! تین چار دن پہلے جھاڑو دیا تھا۔ ایک تو بکریاں اتنی کم بخت ہیں کہ جگہ جگہ گند ڈالتی پھرتی ہیں۔''

اب بھلا ''اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا'' کہنے کے سوا کوئی اور چارہ تھا؟ (باقی آئندہ) ☆☆☆

بلبل

بلبل یا "Nightingale" ایک خوب صورت آواز میں گیت گانے والا پرندہ ہے جس کا تعلق کلاس "Aves" سے ہے۔ بلبل کا سائنسی نام "Luscinia Megarhynchos" ہے۔ اس کی لمبائی 5.9 سے 6.5 انچ (15 سے 16.5 سینٹی میٹر) جو بھورے پَر اور سرخ دُم رکھتی ہے۔ کالے پَروں والی بلبل بھی موجود ہیں۔

دُنیا کے ادب، ڈرامے اور گیت اس پرندے پر تخلیق کیے گئے ہیں۔ یہ پرندہ کیڑے کھاتا ہے اور گھنے پتوں میں گھونسلہ بنا کر رہتا ہے۔ یہ پرندہ رات کو بھی گیت گاتا ہے۔ اسی لیے Nightingale کہلاتا ہے ملک کروشیا (Croatia) کے سکے "Kuna" کی پشت پر بلبل کا نقش بنا ہوتا ہے۔ بلبل کی 130 انواع (species) ہیں۔ مادہ بلبل پانچ گلابی مائل جامنی انڈے دیتی ہے جن میں سے 11 سے 16 دن تک بچے نکل آتے ہیں۔ انسانی پیدا کردہ آلودگی کی وجہ سے 3 انواع کی بلبل کو ناپید ہونے کا اندیشہ ہے۔

نمک پارے

برصغیر پاک و ہند، افغانستان، بنگلہ دیش، ایران وغیرہ میں نمک پارے بڑے شوق سے کھائے جاتے ہیں۔ مہمان نوازی کے طور طریقے بدلنے سے پہلے نمک پاروں سے تواضع کی جاتی تھی اور انہیں نذر نیاز کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ نمک پارے پہلی بار کس نے بنائے، اس حوالے سے کوئی خاص معلومات دستیاب نہیں۔ تاہم مختلف ممالک میں ان کی تیاری کے اجزا مختلف ہیں لیکن ان کا نمکین، خستہ اور خوشبو دار ہونا ان کے معیار کو جانچنے کا پیمانہ ہیں۔ نمک پارے تیار کرنے کے لیے آٹا، میدہ، نمک، مکھن یا

تیل اور پانی کی ضرورت پڑتی ہے۔ ان کو ذائقے دار بنانے کے لیے اجوائن، زیرہ، جو، مکئی کا آٹا وغیرہ بھی شامل کیا جاتا ہے۔ البتہ چکنائی کی وجہ سے موٹاپے کا شکار افراد کو زیادہ نمک پارے نقصان دیتے ہیں۔ اجوائن اور زیرہ شامل ہو جانے سے نمک پارے طبی اعتبار سے زیادہ مفید ہو جاتے ہیں کیوں کہ اجوائن معدے کے افعال کو درست رکھتی ہے۔ نمک پارے کے عنوان سے ڈرامے اور گیت بھی لکھے گئے ہیں۔ نمک پارے (Salty Crackers)

شام کی چائے کے ساتھ اکثر کھائے جاتے ہیں۔

بو علی سینا

جون 1037ء کو دنیا کے عظیم سائنس دان علی الحسین بن عبداللہ بن الحسن بن علی بن سینا المعروف بو علی سینا اور انگریزی میں "Avicenna" کے نام سے مشہور شخصیت نے وفات پائی۔ آپ 980ء میں پیدا ہوئے۔ آپ ایرانی النسل تھے۔ طب، فلسفہ، منطق، علم الکلام، طبعیات، شاعری اور سائنس آپ کی دلچسپی کے مضامین تھے۔ بو علی سینا کو بابائے طب بھی کہا جاتا ہے۔ آپ بخارا کے گاؤں افسانہ (Afsana) میں پیدا ہوئے جو اب ازبکستان کا حصہ ہے۔ بو علی سینا نے کئی علاقوں کا سفر کر کے علم کا خزانہ بنایا اور متعدد کتابیں تحریر کیں جو ادبی علوم، نظری علوم، عملی علوم، رسالہ الزاویہ، رسالہ فی ابطلال، رسالہ فی النباتات والحیوان، کتاب الادویہ، رسالہ فی تشریح الاعضاء وغیرہ کے عنوان سے شائع ہوئیں۔ آپ نے موسیقی پر بھی مقالے قلم بند کیے۔ تاجکستان کے نوٹ پر بو علی سینا کی تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔ بو علی سینا کی یاد میں ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیے گئے ہیں۔ آپ نے 40 کتابیں میڈیکل سائنس پر تحریر کیں جو دنیا بھر کی

لائبریریوں کی زینت ہیں۔ بو علی سینا نے عربی اور فارسی میں شاعری بھی کی۔ ایرانی شہر ہمدان میں آپ کے نام سے یونیورسٹی بھی قائم ہے۔ آذربائی جان میں بو علی سینا کی یادگار بھی بنائی گئی ہے۔

بی پی اپریٹس

خون کا دباؤ معلوم کرنے والے آلہ کو بی پی اپریٹس یا "Sphygmomano Meter" کہا جاتا ہے۔ اسے بلڈ پریشر میٹر بھی کہتے ہیں۔ ان کی دو بڑی اقسام ہیں۔ ایک دستی (Manual) اور دوسرا ڈیجیٹل (Digital)۔ ہمارے ملک میں

اکثر اول الذکر بی پی اپریٹس استعمال ہوتا ہے۔ دستی "Sphygmomano Meter" کو استعمال کرنے کے لیے اسٹیتھو سکوپ (Stetho Scope) بھی درکار ہوتا ہے۔ بلڈ پریشر دو طرح کا ہوتا ہے۔ جب دل کے عضلات سکڑتے ہیں تو اسے "Systolic" پریشر کہتے ہیں اور جب دل کے عضلات (Muscles) پھیلتے ہیں تو اس پریشر کو "Diastolic" کہا جاتا ہے۔ بی پی اپریٹس ایک کف (cuff) پر مشتمل ہوتا ہے جسے مریض کے بازو پر لپیٹ دیا جاتا ہے۔ اسٹیتھو سکوپ کی مدد سے تعین کیا جاتا ہے کہ دل کی دھڑکن سے پیدا شدہ آواز کو نوٹ کر کے خون کے دباؤ کو ماپا جائے۔ ایک نارمل صحت مند انسان کا بلڈ پریشر 120/75 mm Hg ہوتا ہے۔ 1881ء میں "Samuel Siegfried" نے یہ آلہ ایجاد کیا جس میں خون کا دباؤ معلوم کرنے کے لیے مرکری (Hg) کا استعمال شروع کیا گیا۔

☆☆☆

1- رات کو آئے ہر سو گھومے
سوتے میں پیروں کو چومے

2- ایک جگہ پہ لیٹی لیٹی شہروں کو چھو آئے
سارے اس کی چھاتی کوٹیں وہ غصہ نہ کھائے

3- نہ خود آئے نہ خود جائے
سب کو اپنے گھر پہنچائے

4- جب بھی وہ میدان میں آئے
ہر ساتھی کی ٹھوکر کھائے
اُچھلے کودے دوڑے بھاگے
سب ہیں پیچھے وہ ہے آگے

5- اک کھیتی کی شان نرالی
فصل ہے سب کی دیکھی بھالی

6- کاغذ بے شک جتنی بار
آپ سے آپ ہو پھر تیار
چیز ہے اک بالکل بے جان
منہ میں اس کے نہیں زبان
دنیا بھر کے حال بتائے
کیا سمجھے ان پڑھ نادان

(نمرہ عبدالخالق، لاہور کینٹ)

7- اس کے کان پہ میرا منہ
میرے منہ پہ اس کا کان
8- پاس نہیں ہم دونوں پھر بھی
باتیں کیسے کریں؟ پہچان

(مریم رمضان، راولپنڈی)

جوابات: 1- مچھر 2- سڑک 3- راستہ 4- فٹ بال 5- بال
6- کتاب 7- موبائل 8- فون

تلاش کرو

حامد کے ساتھی اسے ستانے کے لیے اِدھر اُدھر چھپ گئے ہیں۔ کیا تم انہیں تلاش کر سکتے ہو؟
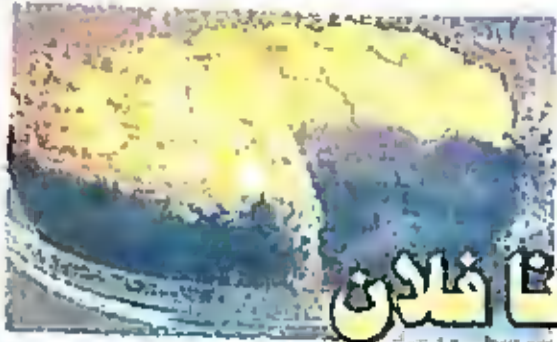
بنانا فلان

اجزاء برائے کرسٹ:

جیلاٹن: دو چائے کے چمچ | کارن فلیکس: تین کپ | مکھن: دو اونس
کیلے: تین عدد | خستہ مونگ پھلی کا مکھن: 1/3 کپ

فلنگ کے لیے:

انڈوں کی زردیاں: چار عدد | براؤن شوگر: آدھا کپ | کارن فلور: دو کھانے کے چمچ
میدہ: دو کھانے کے چمچ | دودھ: دو کپ | پرت (topping) بنانے کے لیے 1/3 کپ
خوبانی کا جیم: 1/3 کپ | لیمن جوس: دو چائے کے چمچ | جیلاٹن: دو چائے کے چمچ | پانی: ایک بڑا چمچ

ترکیب:

1- ساس پین میں دونوں مکھن پگھلا کر کارن فلیکس ملائیں اور دو چائے کے چمچ جیلاٹن گھول کر ساتھ ملا دیں۔ ایک پائی ڈش میں دبا دبا کر پیندے اور دیواروں سے جما دیں اور فریج میں رکھیں۔

2- زردیاں، کارن فلور، چینی، میدہ اور دودھ کو ساس پین میں ڈال کر پکائیں، گاڑھا ہونے پر ڈھانپ کر رکھ دیں اور ٹھنڈا کر لیں۔ پھر کارن فلیکس والی ڈش میں ڈال کر اوپر کیلے کے قتلے سجا دیں۔ پرت تیار کرنے کے لیے جیلاٹن کو پانی میں گھول لیں۔ خوبانی کا جیم اور لیمن جوس گرم کر کے جیلاٹن بھی اس میں ملا دیں اور اس کو کیلے کے قتلوں پر ڈال کر ساری سطح پر پھیلا دیں۔

3- اس سے نہ صرف فلان میں چمک آئے گی، بلکہ قتلے بھی بدرنگ نہیں ہوں گے۔ ٹھنڈا کر کے ڈیزرٹ کے طور پر پیش کریں۔

قورمہ (کراچی کی شادیوں والا)

اجزاء:

گوشت: آدھا کلو | پیاز: چار سے پانچ عدد درمیانے | ادرک: ایک انچ کا ٹکڑا | لہسن: ایک بڑا چمچ پسا ہوا
سفید زیرہ: آدھا چائے کا چمچ | ثابت کالی مرچ: ایک چائے کا چمچ | سبز الائچی: سات عدد | بڑی الائچی: دو عدد
تیز پات: ایک سے دو عدد | لونگ: پانچ عدد | دار چینی: دو سے تین ٹکڑے | جائفل جاوتری: تھوڑی سی
لال مرچ: حسب ذائقہ | نمک: حسب ذائقہ | دھنیا پاؤڈر: دو کھانے کے چمچ | دہی: آدھا کلو | تیل/گھی: حسب ضرورت | کیوڑہ: چند قطرے

ترکیب:

ایک دیگچی میں آدھا کپ تیل/گھی گرم کریں۔ اس میں گوشت ڈالیں۔ اب اس میں نمک، پسی مرچ، دھنیا پاؤڈر، لہسن، لونگ، سبز الائچی، کالی مرچ ڈالیں۔ زیرہ کو ہلکی سے چوٹ مار کر اس میں شامل کریں۔ ادرک کے لچھے کر کے شامل کریں اور گوشت میں ملا دیں۔ اب اس میں حسب ضرورت پانی شامل کر کے گلنے رکھ دیں۔ جب گوشت گل جائے تو اس میں دہی شامل کر کے بھون لیں۔ اسی دوران پیاز کے لچھے کاٹ کر اسے ڈیپ فرائی کر لیں۔ گولڈن براؤن ہونے پر باہر نکال کر ہوا میں رکھ دیں۔ جب چرچری ہو جائے تو اسے ہاتھوں سے مل کر چورا بنا لیں۔ اسے قورمے میں شامل کریں۔ ایک کپ کے قریب پانی شامل کریں۔ بڑی الائچی کو باریک پیس کر چھڑک دیں اور آدھے سے ایک گھنٹا دم دیں۔ قورمہ تیار ہے۔

''امی! میرے پیٹ میں شدید درد ہے۔'' رضا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بھی بہہ رہے تھے اور ساتھ ہی وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے بالکل جھکا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟ کب سے درد ہے میرے بیٹے کو...... ایسا کیا کھا لیا کہ صبح صبح اس قدر شدید درد ہو گیا ہے۔'' امی جان کا دل رضا کے آنسو اور زوردار ہچکیاں دیکھ کر فوراً پسیج گیا۔

''امی درد تو رات ہی سے تھا، پھر رفتہ رفتہ زیادہ ہونے لگا اور اب تو بہت ہی زیادہ ہو رہا ہے۔'' رضا نے ساتھ ہی زوردار کراہ بھری اور شدید درد میں ہونے کا احساس پیدا کیا۔

''امی! یہ تو رات میں بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ مجال ہے کہ ایک دفعہ بھی اُٹھا ہو یا بے چین ہوا ہو۔ بس ابھی میں اسکول کے لیے اُٹھانے لگا تو اسے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگے اور یہ درد درد کا شور مچانے لگا۔'' حمزہ بھیا نے چھوٹے بھائی کو غور سے دیکھتے ہوئے اس کے بیان کی فوراً تردید کی۔

''امی! میں گہری نیند میں نہیں تھا بلکہ بھیا خود ساری رات بے خبر پڑے سوتے رہے۔ میں نے دو تین مرتبہ انہیں آواز بھی دی مگر یہ تو ہلے بھی نہیں۔ آپ یقین کریں کہ میرے پیٹ میں شدید درد ہے۔'' رضا نے غصے سے بھیا کو دیکھا اور پھر سے کراہنے لگا۔

''اچھا...... اگر میں بے خبر سو رہا تھا تو تم نے امی جان کو آواز کیوں نہیں دی۔ وہ بھی تو ساتھ والے کمرے ہی میں تھیں۔ امی! یہ بہانہ بنا رہا ہے۔ دراصل آج اس کا ٹسٹ ہے جس کی اس نے بالکل تیاری نہیں کی۔ اب ٹسٹ اور ٹیچر کی ڈانٹ سے بچنے کے لیے بہانے بازی کر رہا ہے۔ یہ اس کا ڈرامہ ہے ڈرامہ!'' حمزہ نے رضا پر غصے بھری نگاہ ڈالتے ہوئے اس کے جھوٹ کا پول کھول دیا۔

''امی! اگر بھیا کو اتنا شک ہے تو بھیج دیں اسکول۔ گھر میں اتنی حالت خراب ہے تو اسکول میں میرا کیا بنے گا، لیکن بھیا کو تسلی ہو جائے گی کہ میں بہانے نہیں بنا رہا۔'' رضا اب تو درد کے مارے دہرا ہی ہو گیا۔

امی جان نے رضا کو پیار کیا اور حمزہ کو ڈپٹ کر بولیں:
''میرے بچے کے پیچھے نہ پڑ جایا کرو۔ اب اگر ٹسٹ والے دن ہی اس کے پیٹ میں درد ہو جاتا ہے تو اس میں رضا کا کیا قصور۔ وہ بھلا ماں سے جھوٹ کیوں بولے گا۔ ایک تو اسکول والے معصوم بچوں پر اس قدر بوجھ ڈال دیتے ہیں کہ بس......''

''امی میری بات مانیں! اس نے رات کو ہم سب کے ساتھ ہی کھانا کھایا تھا اور پھر دیر تک کھیلتا رہا۔ میں نے ہوم ورک کا پوچھا تو ٹال گیا۔ ٹسٹ تیار کرنا تو دور کی بات اس نے کل کتابیں ہی نہیں کھولیں۔ آپ بے شک اس کا بستہ کھول کر دیکھ لیں، اس نے گھر کا کام نہیں کیا ہوگا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا اسکول

جانے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ آپ ہر مرتبہ اس کی باتوں میں آ کر چھٹی کرا لیتی ہیں۔ اس کا کتنا خراب رزلٹ آتا ہے۔ اس کو تو شرمندہ ہونا آتا نہیں، مجھے ہی شرمندگی اور افسوس ہوتا ہے۔'' حمزہ بھیا بولتے ہی چلے گئے۔

''امی! مجھے دوا دے دیں پلیز۔ کچھ بہتر ہو جاؤں گا تو اسکول چلا جاؤں گا۔'' اب رضا نے امی کو مزید جذباتی انداز میں کہا۔

''امی دیکھئے گا، ہمیشہ کی طرح یہ اسکول کا وقت گزرنے کے فوراً بعد بھلا چنگا ہو کر کھیلنے لگے گا۔ سارا دن مزے کرے گا، آپ سے اپنی خدمتیں کروائے گا۔ میں بڑا ہو کر ایسا آلہ ایجاد کروں گا جو پیٹ اور سر کے درد کو ناپ سکے۔ خصوصاً اس طرح کے بہانے بازوں کے درد کو۔'' حمزہ بھیا بے بسی سے بولے۔

''اچھا! اب بس کرو، اتنا مت ڈانٹو۔ چھوٹا بھائی ہے، تم تیار ہو جاؤ اسکول سے دیر ہو رہی ہے۔'' امی رضا کے آنسو پونچھتی ہوئی حمزہ کو ڈانٹنے لگیں۔ ''رضا دوا سے پہلے آپ کچھ کھا لیں اور پھر آرام کر لینا۔'' وہ رضا کو پیار کرتی ہوئیں باورچی خانے کی طرف روانہ ہوئیں۔ ان کے جاتے ہی رضا نے حمزہ بھیا کو منہ چڑایا اور دوبارہ اپنے بستر میں گھس گیا۔ آج واقعی اس کا اُردو کا ٹسٹ تھا جس کی وجہ سے اس کا ارادہ چھٹی کا بنا تھا۔ ویسے بھی اسے سیر کے فائدے یا ورزش کے فائدے والے مضمون یاد کرنے سے زیادہ بیمار ہونے کے فائدوں کا عملی مظاہرہ کرنا دل و جان سے پسند تھا۔ چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ گھر بھر کا لاڈلا تھا۔ کھیلنے کودنے میں اس کا خوب دل لگتا۔ اسے کھیلنے کے لیے دوسروں کی ضرورت کم ہی پڑتی۔ اس کے پاس بے شمار کمپیوٹر گیمز تھیں۔ کھلونے تھے اور ٹی وی پر کارٹونز بھی۔ اسکول جانا اور اساتذہ کی نصیحتیں سننا اسے ہمیشہ بور کام لگتا تھا۔

بیمار ہونے کے بے شمار فوائد اس کے دل و دماغ میں ہر وقت گھومتے رہتے۔ پہلا فائدہ تو بڑوں کی ہمدردی کا حصول تھا۔ بیمار بچہ سب کی آنکھوں کا تارا بن جاتا ہے۔ اس کے ناز نخرے اُٹھائے جاتے ہیں۔ فرمائشیں پوری ہو جاتیں ہیں۔ امی اسے خود اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتیں۔ صبح سویرے اُٹھ کر تیار ہونا اور اسکول جانا جیسا مشکل کام کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی۔ بیمار بچہ اپنی مرضی سے جب تک چاہے سو سکتا تھا۔ صبح سب بچوں کی غیر موجودگی میں امی اور دادی سے نخرے اُٹھوا سکتا تھا۔ کمپیوٹر پر جتنی مرضی دیر کھیل سکتا تھا۔ الغرض بیماری اپنے ساتھ بے شمار آسانیاں لاتی ہے۔ بس خود کو زیادہ بیمار دکھانے کے لیے خاص اداکاری کی ضرورت پڑتی ہے جس میں رضا میاں ماہر تھے۔

سو اس قدر افادیت کے پیشِ نظر رضا میاں ہفتے میں ایک مرتبہ پیٹ کے درد میں مبتلا ہوتے تو دوسری مرتبہ سر درد میں۔ اب تو اسے فلو کی علامات خود پر طاری کرنے کی بھی ایسی مشق ہو چکی تھی کہ امی ابو بآسانی دھوکے میں آ جاتے۔ دادی اسے اپنے تخت پر خوب آرام سے لٹا دیتیں اور خشک میوہ جات خود چھیل چھیل کر کھلاتی رہتیں۔ رضا کو دوائیں کھانے کا بھی خاصا شوق تھا جو کہ بقول دادی جان کے اسے اپنے دادا سے ورثے میں ملا تھا۔ دادا جان بھی ساری عمر دواؤں ہی کے عشق میں مبتلا رہے تھے اور اب پوتا بھی رنگ برنگے سیرپ بآسانی بلکہ برغبت نوش جان کرتا۔ رضا کے خیال میں ہر دوا کا کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہوتا تھا۔ سو وہ غیر ضروری ادویات بھی موقع ملتے ہی استعمال کر کے کسی نہ کسی

طاقت یا صحت کے حصول کے لیے استعمال کر لیتا۔

چناں چہ اب رضا کی بہانے بازی کے درمیان وقفہ کم ہونے سے امی ابو اور بھیا کے شکوک وشبہات میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور پانچویں کے امتحانات میں مایوس کن کارکردگی کے بعد ابو اس پر عموماً غصہ کرتے دکھائی دیتے مگر اپنی بے مثال اداکاری سے وہ سب کو بے وقوف بنا لیتا۔ حمزہ بھیا اب اپنی نویں جماعت کی پڑھائی میں بے حد مصروف ہو کر اس کے پول کھولنے سے باز آ گئے تھے اور رضا صاحب اپنی خود کی بنائی ہوئی دُنیا اور اپنے مفروضات کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے بالکل آزاد تھے۔

اسکول میں موسم بہار میں ایک بڑا جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہونے جا رہا تھا۔ کلاس ششم کے تمام بچے ایک ٹیبلو پیش کر رہے تھے۔ رضا روز کی تیاریاں، بچوں اور اساتذہ کا جوش وخروش دیکھ کر خوب خوش تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اسے بھی پروگرام میں حصہ لینے کا موقع ملے گا مگر ٹیچر نے اسے یکسر نظرانداز کر دیا۔ رضا کے پریشان ہو کر پوچھنے پر ٹیچر نے جواب دیا کہ رضا تو ایک بیمار اور کمزور بچہ ہے، بھلا اتنے جوش اور ہمت والا پروگرام کیسے دکھا سکے گا۔ ٹیچر نے اسے بہلانے کے لیے ایک خاکے میں محض ساکت کھڑے پودے کا کردار دینے کا وعدہ کیا۔ رضا کو اپنی خراب رپورٹ پر اتنا صدمہ نہ ہوا تھا جتنا پوری کلاس کے سامنے بیمار اور کمزور کہلوائے جانے پر۔ وہ بھول گیا تھا کہ ہفتے میں دو سے تین مرتبہ بیماری کے نام پر کی جانے والی چھٹیاں یہی رنگ لا سکتی ہیں۔ خود کو خصوصی برتاؤ کا مستحق قرار دلوانے کے چکر میں اس نے اپنے آپ کو جاہل اور کمزور بنا لیا تھا۔ ہر وقت نقاہت، کمزوری اور درد کی اداکاری کرتے کرتے، یہ سب اب اس کی عادت ثانیہ بن چکی تھی۔ اب اس کی خراب کارکردگی پر اسے سرزنش بھی نہ کی جاتی تھی۔ چھٹیوں کی وجہ سے وہ نظرانداز ہو رہا تھا۔ اسکول میں اسپورٹس ڈے پر حمزہ بھیا نے چار ٹرافیاں جیتیں اور رضا کو ایک بھی ریس میں شامل نہ کیا گیا۔ رضا کو رفتہ رفتہ احساس ہو رہا تھا کہ جھوٹ اور پھر جھوٹ پر مسلسل اصرار انسان کی قدر و قیمت کم بلکہ ختم کر دیتا ہے۔

ساتویں جماعت میں اسے ابا جان کی سفارش پر ترقی دی گئی۔ وہ اپنے ساتھ کے بچوں سے خاصا بلکہ بہت پیچھے تھا۔ اب ابو اور امی اس پر خفا بھی ہوتے اور بار بار احساس بھی دلاتے کہ پڑھائی میں وہ کس قدر کمزور ہے۔ ساتویں میں اس کی جماعت میں ایک نیا بچہ داخل ہوا۔ شعیب جس کے ساتھ آنے والی ایک وہیل چیئر یقیناً کلاس کے بچوں کے لیے نئی بات تھی۔ شعیب بچپن میں پولیو کا شکار ہونے کی وجہ سے ٹانگوں سے محروم ہو گیا تھا۔ شعیب کے ساتھ اس کی بیساکھیاں بھی ہوتیں اور وہ اکثر ان کے سہارے کھیلنے کے لیے میدان میں چلا آتا۔ نارمل بچوں کے ساتھ کھیلنے کی بھرپور کوشش کرتا اور خوب خوش ہوتا۔ وہ کرکٹ میں بیٹنگ اور باؤلنگ نہیں کر پاتا تھا مگر کیچ خوب مہارت سے پکڑتا۔ رضا کے لیے شعیب ایک مثال بن گیا تھا۔ پڑھائی میں وہ کسی بھی رعایت کا طلب گار نہ ہوتا۔ اس کی سنجیدگی اور محنت نے جلد ہی اسے کلاس کے پوزیشن ہولڈرز میں شامل کر دیا۔ رضا اکثر شعیب کے ساتھ ہی بیٹھ جاتا اور شعیب کی بلند ہمتی اسے شرمندہ کر دیتی۔ محض اپنی سستی، کاہلی اور کام چوری کی عادت کو اس نے بیماری کے بہانے تلے چھپانے کی کوششیں کی تھیں۔ اپنے جسم کے تمام اعضاء کی درستگی اور سلامتی کے باوجود خود کو کمزور اور مجبور ثابت کر کے بے جا رعایات اور توجہ لیتا رہا تھا۔

شعیب کو دیکھ کر رضا کو پہلی بار بیماریوں کے فوائد کی بجائے صحت کی نعمت کا احساس ہوا تھا اور اب اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ مسلسل محنت کر کے اپنی تمام تعلیمی کمزوریاں دُور کر لے گا۔ اپنی صحت کا شکر ادا کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور طریقہ نہیں کہ اپنی صلاحیتوں کا مکمل اور مسلسل استعمال کیا جائے اور رضا کو جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ دوسروں کی نگاہوں میں ہمدردی سے زیادہ کام یابی پر فخر کا احساس زیادہ تسکین کا باعث بنتا ہے۔

☆☆☆

ہیضے کی احتیاطی تدابیر

☆ گرمیوں کے موسم میں غذا ہمیشہ بھوک رکھ کر کم کھائی جائے۔
☆ غذا مقررہ اوقات میں کھائی جائے کہ پہلی غذا ہضم ہو جائے۔
☆ کھانے میں لیموں، پیاز اور سرکہ استعمال کریں۔
☆ کچے اور باسی پھلوں سے پرہیز کریں۔
☆ گھر میں صفائی رکھیں اور اجوائن کی دھونی دیں۔
☆ صبح اور شام کے اوقات میں سیر کی جائے۔
☆ ابلا پانی پئیں۔ برتنوں اور غذا کو ڈھانپ کر رکھیں۔
☆ جلاب لینے سے پرہیز کریں۔ ہیضے میں لیموں کا رس نچوڑ کر اس میں 4 گنا پانی اور تھوڑا سا نمک ملائیں اور ہر پانچ منٹ کے بعد ایک چمچ لیتے رہیں۔
☆ اگر مریض کو شدید قے ہو تو لیموں کو چیر کر نمک چھڑک دیں اور تھوڑا تھوڑا رس چوسنے کی ہدایت کریں۔

عاجِ فیل

سندباد جہازی کا آخری سفر

کاشف ضیائی

جب سراندیپ کے بادشاہ نے بغداد کے خلیفہ ہارون الرشید کی خدمت میں طرح طرح کے تحفے بھجوائے تو اس سے نہ صرف خلیفہ کو بلکہ سارے درباریوں کو بہت خوشی ہوئی اور انہوں نے ان تحفوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ میں چھٹے سفر کے بعد مزے کی زندگی گزار رہا تھا۔ دربار کے اکثر وزیروں سے میرے بڑے اچھے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ دن رات بڑی خوشی سے گزر رہے تھے کہ ایک دن خلیفہ کا بھیجا ہوا ایک سرکاری افسر میرے گھر آیا اور مجھے بتایا کہ کل صبح تمہیں دربار بلایا گیا ہے۔ میں بہت حیران ہوا، خیر تو ہے کہ آخر کل مجھے دربار میں خاص طور پر کیوں بلایا جارہا ہے؟

بہرحال اگلے دن دربار پہنچا تو خلیفہ نے حکم دیا کہ سندباد پہلے تم سراندیپ کے بادشاہ کے تحفے میرے پاس لاتے تھے اب زحمت کرو اور ہمارے تحفے سراندیپ لے کر جاؤ۔

خلیفہ کا یہ حکم بجلی بن کر میرے سر پر گرا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے یہی بات سنی ہے یا کوئی اور، بہت جان چھڑانے کی کوشش کی لیکن حکم آخر حکم ہوتا ہے۔ میں نے ہامی بھر لی اور دوبارہ سراندیپ کے سفر کی تیاری شروع کر دی۔

اس دفعہ میں ایک نئے بحری راستے سے سراندیپ روانہ ہوا۔ میرے ساتھ بغداد کے عزت دار لوگوں کا پورا ایک گروپ بھی تھا۔ جب ہم ساحل پر اُترے اور اپنا تعارف کروایا تو پہلے پوری بندرگاہ پر اور پھر پورے شہر میں ہمارے آنے کی خبر پھیل گئی۔ اسی دوران شاید فوجی جاسوسوں نے بادشاہ تک ہماری اطلاع پہنچا دی اور یوں بادشاہ نے ایک جماعت کو شاہی طور پر ہمارے استقبال کے لیے بھیج دیا۔

سراندیپ کا بادشاہ واقعی بہت بااخلاق اور نیک نفس تھا۔ اس نے تین دن تک ہماری خوب آؤ بھگت کی۔ خلیفہ کے تحفوں کا شکریہ ادا کیا۔ بدلے میں اچھے جذبات کا اظہار کیا اور جب ہماری روانگی کا وقت آیا تو ہمیں شاہی اعزاز کے ساتھ خود ساحل سے روانہ کرنے آیا۔ ہم واپس بغداد کی طرف آرہے تھے۔ موسم بھی خوش گوار تھا اور سمندری طوفان کا بھی کوئی ڈر نہ تھا لیکن اس دفعہ ایک نئی مصیبت ہوئی۔ جب ہم سراندیپ سے تین چار سو میل دُور کھلے سمندر میں آ گئے تو بحری قزاقوں نے حملہ کر دیا۔ قزاق، بحری ڈاکوؤں کو کہتے ہیں۔ جس طرح خشکی پر ڈکیتی ہوتی ہے اسی طرح سمندر میں بھی مسافر جہازوں کو لوٹا جاتا ہے اور ان لوٹنے والوں کو قزاق کہتے ہیں جو اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے کسی بڑے جہاز کو گھیر لیتے ہیں اور پھر اس پر موجود سارا تجارتی سامان لوٹ لیتے ہیں اور مسافروں کو سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔

قزاقوں نے ہمیں حکم دیا کہ کوئی حرکت نہ کرے ورنہ اپنی جان کا خود ذمہ دار ہوگا۔ اس کے بعد سارے جہاز پر قبضہ کر لیا اور ہمارے پاس موجود سب تحفے تحائف چھین لیے۔ ہمارا کپتان بہت

بہادر آدمی تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر مقابلہ کرنا چاہا لیکن اس بہادری نے اس کی جان لے لی۔ ہم سب مجبور تھے، ان خونی ڈاکوؤں کا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، لہٰذا سب کے ہاتھ کمر پر باندھ دیئے گئے اور اس کے بعد ہمیں بہت دُور ایک جزیرے پر لے جایا گیا۔

جزیرے کے شروع کے حصے میں آبادی تھی اور آبادی کے پیچھے جنگل نظر آ رہا تھا جس کی کوئی حد نہ تھی۔ آبادی میں ایک بازار بھی تھا۔ ہمیں بندھی ہوئی حالت میں بازار میں کھڑا کر دیا گیا، پھر ڈاکوؤں نے آتے جاتے لوگوں کو دعوت دی کہ ان میں سے جس غلام کو خریدنا چاہو، قیمت دے کر خرید لو۔ لوگوں نے بڑھ چڑھ کر بولیاں لگائیں۔ میرے تمام ساتھی بک گئے۔ مجھے بھی ایک امیر تاجر نے خرید لیا اور اپنے گھر لے آیا۔ اس کا گھر بڑا وسیع اور بلند تھا۔ وہاں دوسرے غلام بھی تھے۔ مجھے بھی غلاموں والا لباس پہنا دیا گیا اور ایک کوٹھڑی رہنے کے لیے دے دی گئی۔

تین دن بعد میرے مالک نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ تم کون ہو اور کیا کام کر سکتے ہو؟ مجھے رونا آ گیا، آنسو میری آنکھوں سے رواں ہو گئے اور میں اپنی قسمت پر دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس دوران میرا مالک ذرا بھی مجھ سے متاثر نہ ہوا۔

پھر جب غم ذرا ہلکا ہوا تو میں نے اسے بتایا کہ میرا نام سندباد ہے اور میں بغداد کا ایک تاجر ہوں۔ مجھے قزاقوں نے اغوا کر کے تمہارے ہاتھ بیچ دیا ہے۔ اب میرے مالک کا دل ذرا سا پسیجا اور اس کے چہرے پر رحم کے اثرات نمایاں ہو گئے۔ پھر اس نے دوسرے غلاموں کو حکم دیا کہ سندباد کو کچھ نہ کہو، اسے اپنی کوٹھڑی میں جانے دو اور ایک ہفتے بعد دوبارہ میرے سامنے پیش کرنا۔ چناں چہ میں اپنی کوٹھڑی میں واپس آ گیا اور زندگی کے دن گزارنے لگا۔ مجھے صبح و شام کا کھانا باقاعدگی سے دے دیا جاتا جو بہت عمدہ اور لذیذ ہوتا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور مستقبل میں میرا کیا بنے گا؟

ایک ہفتے بعد میرے مالک نے مجھے پھر بلایا اور پوچھا کہ سندباد تم تیر کمان چلانا جانتے ہو؟ میرے چہرے پر چمک نمایاں ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ”میرے آقا! میں نے جوانی میں فوجی فنون سیکھے تھے اور میں اُن کی مشق بھی کرتا رہا ہوں۔ تیر کمان سے نشانہ لگانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے اور میں اس فن میں بہت ماہر ہوں۔“

میرے مالک نے کہا کہ میں تمہارا امتحان لوں گا۔ چناں چہ مجھ سے چالیس گز کے فاصلے پر ایک چھتری گاڑ دی گئی اور اس چھتری پر ایک سیب ٹکا دیا گیا۔ پھر میرے آقا نے حکم دیا کہ تیر کمان اُٹھاؤ اور اس سیب کے دو ٹکڑے کر کے دکھاؤ۔

میں نے اللہ کا نام لے کر تیر کمان ہاتھ میں لیا اور ایسا تاک کر نشانہ لگایا کہ تیر سیب کو درمیان سے چیرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا اور سیب دو ٹکڑے ہو کر زمین پر گر گیا لیکن اسی دوران چھتری کو کچھ بھی نہ ہوا۔ یہ ایسا منظر تھا کہ سب حیران ہو گئے اور تمام غلاموں نے زور سے نعرہ لگایا۔

میرا مالک بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ کل صبح تمہیں میرے ساتھ جنگل میں چلنا ہوگا۔ اگلے دن صبح سویرے میں، میرا مالک اور چار غلام گھوڑوں پر بیٹھ کر جنگل روانہ ہوئے۔ کافی چلنے کے بعد جب جنگل بہت گہرا ہو گیا تو سامنے ایک تالاب آیا جو بہت پھیلا ہوا تھا اور اس کی گہرائی بھی زیادہ تھی۔

اس تالاب کے چاروں طرف بلند و بالا درخت تھے جن کی شاخیں اتنی گھنی تھیں کہ اگر کوئی شخص چھپ جائے تو نظر نہ آئے۔

میرا مالک مجھے ساتھ لے کر ایک ایسے ہی درخت پر چڑھا اور مجھے سمجھایا کہ سندباد اب تمہارا کام یہ ہے کہ اس تالاب پر جو ہاتھی بھی پانی پینے آئے تم نے اس کی کمر پر نشانہ لگا کر اسے گرانا ہے۔

اس جزیرے پر ہاتھیوں کی کثرت تھی اور جنگل کا یہ تالاب اور اس کے اردگرد کا علاقہ انہی ہاتھیوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ مجھے سمجھ نہ آئی کہ میرا مالک ہاتھی مار کر کیا کرنا چاہتا ہے؟ بہرحال میں نے ہامی بھر لی۔ اس کے بعد میرا مالک مجھے حفاظت کی دعائیں دیتا ہوا نیچے اتر گیا۔ مجھے تھوڑی سی خوراک ایک پوٹلی میں باندھ کر دے دی گئی اور سب لوگ محل آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔

میں چوکس ہو کر درخت پر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو ہاتھیوں کا ایک جتھا تالاب پر پانی پینے آیا۔ میں نے سنبھل کر ایک ہاتھی کی پیٹھ کو نشانہ بناتے ہوئے تیر چلایا۔

ایک ہیبت ناک چنگھاڑ بلند ہوئی اور ہاتھی گر کر تڑپنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر میں ہاتھی ٹھنڈا ہو گیا اور باقی خطرہ سمجھ کر بھاگ گئے۔

میرا مالک مجھے پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ نشانہ کہاں لگانا ہے اور میں بھی جانتا تھا کہ فلاں مقام پر ہاتھی کی ریڑھ کی ہڈی بہت کمزور ہوتی ہے، اگر وہاں تیر لگ جائے تو ہاتھی بچ نہیں سکتا۔

اگلے دن میرا مالک آیا تو مرا ہوا ہاتھی اس کے سامنے تھا اور میں درخت پر چوکس بیٹھا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا، مجھے نیچے اتروا کر گلے سے لگایا اور واپس شہر سے جا کر میری اچھی بھلی دعوت کی۔

اب مجھے پتا چلا کہ اس جنگل میں ہاتھیوں کی بہتات تھی اور یہ

لوگ ہاتھی دانت کا کاروبار کرتے تھے۔ اس علاقے میں ہاتھی دانت کو عاج فیل کہا جاتا تھا۔

اگلے دن سے میری یہی ڈیوٹی ہو گئی کہ جنگل جایا کروں اور تالاب پر آنے والے کسی نہ کسی ہاتھی کو شکار کیا کروں۔

چناں چہ دن یوں ہی گزرتے گئے۔ میرا مالک مجھ سے بڑا راضی ہوا۔ اسی طرح تین مہینے گزر گئے۔ ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔ میں اپنے معمول کے مطابق تالاب کے کنارے ایک درخت پر بیٹھا تھا کہ میں نے دیکھا سو سے زیادہ ہاتھی تالاب پر آ گئے۔ میں حیران تھا کہ آج سارے جنگل کے ہاتھیوں کو ایک ہی وقت میں پیاس لگ گئی ہے۔ ان میں سے ایک ہاتھی نے پانی اپنی سونڈھ میں بھرا، میرے درخت کے پاس آیا، پانی درخت کی جڑ میں ڈالا اور ذرا پیچھے ہو کر درخت کو ایسی زوردار ٹکر ماری کہ میں ہل گیا۔ اس کے دوسرے ہاتھی نے یہی سب کچھ کیا۔ یعنی سونڈھ میں پانی بھرا، میرے درخت کی جڑ میں ڈالا اور درخت کو ٹکر ماری۔ پھر ایک ایک کر کے سارے ہاتھی یہی کچھ کرنے لگے۔

میں سمجھ گیا کہ یہ مجھے گرانا چاہتے ہیں۔ درخت چاہے جتنا بھی مضبوط ہوتا، ان مست ہاتھیوں کی ٹکروں کی کب تک تاب لا سکتا تھا۔ چناں چہ درخت گر گیا اور میں بھی بُرے طریقے سے زمین پر آ گرا۔ اس صدمے سے میرے ہوش و حواس کھو گئے۔ ذرا دیر بعد جب ہوش آیا تو دیکھا کہ میں سب سے بڑے ہاتھی کی کمر پر سوار ہوں۔ وہ آگے آگے ہے اور سارے ہاتھی اس کے پیچھے قافلہ بنا کر چل رہے ہیں۔

غالباً میری بے ہوشی کے دوران بڑے ہاتھی نے جو ان کا سردار تھا، مجھے سونڈھ سے اُٹھا کر اپنی پیٹھ پر چڑھا لیا تھا۔ میرے لیے یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ مجھے کہاں لے کے جا رہے ہیں؟

ہاتھی جنگل کے ویران حصے کی طرف آ گئے۔ اس کے بعد مجھے ایسی جگہ لے آئے جہاں ہر طرف مردہ ہاتھیوں کی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ ان میں ہاتھی دانت یعنی عاج فیل بھی اِدھر اُدھر پڑے تھے۔

مجھے زمین پر ڈال دیا گیا اور پھر تمام ہاتھی پیچھے ہٹ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ شاید ہاتھیوں کا قبرستان تھا۔ اس جگہ کو دیکھ کر تو یوں ہی معلوم ہوتا تھا۔ ہر طرف ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔

کافی دیر خاموشی رہی۔ اس دوران میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا اور ہاتھی دُور کھڑے کان ہلاتے رہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ ہم بے زبان جانوروں کو کیوں ہلاک کرتے ہو۔ عاج فیل چاہیے تو یہاں سے لے لیا کرو۔ چناں چہ تھوڑی دیر بعد میں ان کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا شہر کی طرف چل پڑا اور گھر پہنچ کر اپنے مالک کو ساری بات بتا دی۔ میرے مالک نے یہ بات جزیرے والوں کو بتائی۔ وہ سب بہت حیران ہوئے کہ ہمیں معلوم ہی نہ تھا کہ اس جنگل میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں ہاتھیوں کے اتنے عاج فیل موجود ہوں گے۔ چناں چہ وہ سب جماعت بنا کر میری راہ نمائی میں اس جگہ پہنچے جہاں مجھے ہاتھی لے گئے تھے۔ میرا مالک تو یہ سارا منظر دیکھ کر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے مجھے آزاد کر دیا۔ اس سے اگلے دن جزیرے کے لوگوں نے مل کر عہد کیا کہ آج کے بعد ہم ہاتھی نہ ماریں گے اور پھر ٹولیاں بنائی گئیں جو اس جگہ سے ہاتھی دانت اکٹھے کر کے لائیں اور لوگوں میں بانٹیں۔ مجھے بھی میری حیثیت کے مطابق ہاتھی دانت ملے۔

اب میں آزاد تھا اور مجھے ہر جگہ آنے جانے کی آزادی تھی۔ چناں چہ میں اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کب کوئی جہاز اس جزیرے کے ساحل تک آئے اور میں اس پر سوار ہو کر یہاں سے نکلوں۔ میری مراد جلد ہی بر آئی اور ایک بھولا بھٹکا تجارتی جہاز اس طرف آ گیا۔ میں پھر دوبارہ تاجر بن کر اس پر سوار ہو گیا اور دو ہفتے تک لگاتار سفر کے بعد بغداد پہنچ گیا۔ اس مرتبہ میرے پاس عاج فیل یعنی ہاتھی دانت تھے اور یہ دُنیا کی قیمتی ترین چیز ہے، جبھی تو اسے اس جزیرے میں بڑی محنت سے حاصل کیا جاتا تھا۔ میں نے بہت زیادہ قیمت پر عاج بیچ دیے اور جو رقم حاصل ہوئی اس کو نیکی کے مختلف کاموں میں لگا دیا۔

یہ ساتواں سفر میرا آخری سفر تھا۔ اب میں بوڑھا ہو چکا تھا اور مزید سفروں کے قابل بھی نہ تھا۔ سونے سے پہلے میں نے اپنے ان تمام سفروں کی داستان لکھوا دی تاکہ آنے والی نسلیں دیکھیں کہ انسان پر بعض اوقات کیسے کیسے حالات گزرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ بھی انسان کی کیسے کیسے مدد کرتا ہے۔

آخر میں مَیں ایک بات ضرور کہوں گا کہ مجھ پر بڑی بڑی مصیبتیں آئیں اور ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ زندہ بچ جانا بہت مشکل تھا لیکن جب بھی کوئی مصیبت یا تکلیف مجھ پر آتی تو میں اللہ کو یاد کرتا۔ اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں سے میری نجات کی کوئی صورت بنا ہی دیتے۔ واقعی تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔

پیڑ کو دیمک لگ جائے یا آدم زاد کو غم
دونوں ہی کو امجد ہم نے بچتے دیکھا کم

(مریم رضوان، راول پنڈی)

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

☆

نہیں کھیل اے داغ! یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں، آتے آتے

(عائشہ صدیقہ، جہلم)

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں
عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

(ہاجرہ ابراہیم ملک، راول پنڈی)

ست کیوں مانتے ہو اوروں کے دربار سے اقبال
وہ کون سا کام ہے جو ہوتا نہیں تیرے پروردگار سے

(محمد حسنین معاویہ، ڈی آئی خان)

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

کوئی قابل ہو تو شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

(صبا شوکت، گوجرانوالہ)

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

(مقدس چوہدری، راول پنڈی)

کیا خوب پسند تھی تیرے اے فرشتۂ اجل!
تو نے پھول ہی وہ چنے جو سارے گلشن کو ویران کر گئے

(اقصیٰ، عائشہ، قلعہ دیدار سنگھ)

غم زندگی سناؤں میرا وطن جل رہا ہے
میں خوشی کہاں سے لاؤں، میرا وطن جل رہا ہے
تمہیں یہ گلہ ہے یارو کہ مزاج کیوں ہیں برہم
کہو کیسے مسکراؤں، میرا وطن جل رہا ہے

(مدیحہ ادریس مغل، قلعہ دیدار سنگھ)

خدا کرے کہ میری ارض پاک پر اترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو
یہاں جو پھول کھلے وہ کھلا رہے صدیوں
یہاں خزاں کو گزرنے کی بھی مجال نہ ہو

(عاقب الرحمان آرائیں، ٹانک)

ابھی سوکھی نہیں دیوار گھر کی
کہ پھر بارش کا موسم آ گیا ہے

(محمد قمر الزماں صائم، خوشاب)

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

☆

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

(محمد بلال عارف سقی، پل بجواں)

یارانِ جہاں کہتے ہیں کہ کشمیر ہے جنت
جنت کسی کافر کو ملی ہے نہ ملے گی

(رانا بلال احمد، کوٹلہ ضلع بھکر)

کبھی اے حقیقت منتظر! نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

(عبدالجبار رومی انصاری، لاہور)

زنداں میں بھی آرام سے دن میرے کٹے ہیں
زنجیر سے آتی رہی اس زلف کی خوشبو!

(محمد شفقت سیال، جھنگ)

"زومبی!" دونوں لڑکوں نے ایک ساتھ چیخ کر کہا۔

"جی ہاں، زومبی۔" امجد بولا۔ "یہ افریقی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہے، زندہ لاش۔"

"بہرحال، یہ ایک پُرانا وہم ہے، جسے اب کوئی نہیں مانتا۔" عامر نے کہا۔

"لیکن ہمارے علاقے کے لوگ مانتے ہیں۔ بوڑھے آدمی مدتوں سے اسے جنگل میں آوارہ پھرتے دیکھ رہے ہیں۔ اسی زومبی نے اب مجھے کار سمیت سڑک کے کنارے گرا کر زخمی کیا تھا۔" امجد نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"خدا کے لیے عقل کی بات کیجیے! کہیں زومبی کار چلا سکتی ہے؟ میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھی ہے۔ نمبر مجھے یاد ہیں۔ ابھی پولیس اسٹیشن پر فون کر کے پوچھتا ہوں کہ وہ کس کی کار ہے۔" عامر نے کہا اور فون کرنے چلا گیا۔

"مگر آپ کیوں اس کار کے متعلق پوچھ رہے ہیں؟ کیا آپ نے وہ کار دیکھی ہے؟" سب انسپکٹر نے عامر سے پوچھا۔ جواب میں عامر نے پہلے تو اپنا تعارف کرایا پھر سارا واقعہ بیان کر دیا۔ اس پر سب انسپکٹر نے قہقہہ لگا کر کہا:

"ٹھیک ہے۔ آپ کے والد صاحب ہمیں مل چکے ہیں اور اس جگہ آپ دونوں بھائیوں کی موجودگی کا ابھی ہمیں علم ہے۔ ہم اس کار پر کڑی نظر رکھیں گے مگر زومبی کو گرفتار کرنے کا وعدہ نہیں کرتے۔ ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ کار آپ ہی کے علاقے کے ایک زمیندار ولیم کی ہے، جو کل شام چوری ہو گئی تھی۔ ہمارے پاس اس کی رپورٹ درج ہے۔" عامر نے انسپکٹر کا شکریہ ادا کیا اور عمار اور امجد کے پاس واپس آ گیا۔

"میں نے ولیم کے دو تین کارندوں سے کہا تھا کہ میں ایک کام سے باہر جا رہا ہوں۔ میرے مکان پر نظر رکھنا مگر مجھے کار چوری کے متعلق کسی نے نہیں بتایا۔" امجد کہنے لگا۔

"بس وہیں تمہارے مخالفوں میں سے کوئی سن رہا ہو گا اور اسی کے اشارے پر تمہارا تعاقب کیا گیا۔" عامر نے کہا۔

"آپ کے خیال میں جنگل کی آگ اور اس زومبی کے درمیان کیا تعلق ہے اور اس نے آپ کو کیوں نقصان پہنچانے کی کوشش کی؟" عمار نے امجد سے پوچھا۔

امجد نے اپنی جیب ٹٹول کر کوئی چیز نکالی اور میز پر رکھتے ہوئے بولا: "یہ دیکھیے!"

عامر نے میز پر سے ایک بڑے سائز کا بٹن اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے حیران ہو کر بولا: "یہ بٹن؟ اس کی کیا

اہمیت ہے؟ ذرا وضاحت سے بتایئے!"

"آپ کو پتا ہے کہ کینیا پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ 1952ء میں کینیا کے وطن پرستوں نے انگریزوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کی اور آخر 1963ء میں وہ اپنے ملک کو انگریزوں کے قبضے سے آزاد کرانے میں کام یاب ہو گئے۔ انگریزوں کی فوج میں کرائے کے سپاہی بھی تھے جو انہوں نے "ہیئن" نامی ایک افریقی قبیلے سے بھرتی کیے تھے۔ یہ بٹن انہی سپاہیوں میں سے کسی سپاہی کا ہے۔ یہ دیکھیے، بٹن پر H کا حرف کھدا ہوا ہے، جس کا مطلب ہے ہیئن۔ وطن پرستوں نے ان میں سے بہت سے سپاہیوں کو اس جنگل میں گھیر کر مار ڈالا تھا اور یہاں کے لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ان سپاہیوں کے بھوت اس جنگل میں رہتے ہیں۔ بہت سے لوگوں نے انہیں دیکھا ہے۔"

"لیکن یہ بٹن آپ کو کہاں ملا؟" عامر نے سوال کیا۔

"مجھے پولیس نے جنگل میں آگ لگنے کی خبر دی کیوں کہ میرا مکان خطرے میں تھا۔ میں اور میرا دوست ٹوگو وہاں پہنچے۔ آناً فاناً آگ ہمارے گھر کے قریب پہنچ گئی اور قریب تھا کہ اسے بھی لپیٹ میں لے لے کہ فائر بریگیڈ والوں نے اس پر قابو پا لیا۔ ٹوگو کو یہ بٹن وہیں راکھ میں پڑا ملا۔ اس نے اُٹھا کر مجھے دکھایا۔ اس کا بھی یہی خیال ہے کہ آگ اسی زومبی نے لگائی ہے۔ اس نے ہمیشہ وہی وردی پہن رکھی ہوتی ہے جو آج پہنی ہوئی تھی۔ گہری نیلی پینٹ، بش کوٹ پر سرخ پٹی اور پی کیپ۔" امجد نے بتایا۔

"آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ ہیئن یونی فارم کا بٹن ہے؟ آپ نے پہلے کبھی ایسا بٹن دیکھا ہے؟" عمار نے پوچھا۔

"یہ بات مجھے ٹوگو نے بتائی تھی۔ ایسی چیزوں میں اس کی معلومات بہت زیادہ ہیں۔" امجد نے کہا۔

"یہ کسی نے شرارت کی ہے تاکہ آپ زومبی پر شبہ....." عامر پوری بات کہنے نہ پایا تھا کہ باورچی خانے میں سے چیخوں کی آواز آئی۔ وہ تینوں باورچی خانے میں گئے تو ان کی پھوپھی اور چچی دہشت زدہ سی کھڑی تھیں۔ پھوپھی منصورہ نے بیلچے کو کھڑکی کی طرف تان رکھا تھا اور اشارے سے بتا رہی تھیں۔

"ادھر کوئی ہے، سخت بھیانک صورت ہے اس کی۔"

"لاش کی طرح سفید رنگت اور آنکھوں کی بجائے سیاہ حلقے۔ ہمارے چلانے پر وہ ادھر کو بھاگ گیا۔" چچی نے بھی اشارے سے بتایا۔

عمار اور عامر باورچی خانے کے پچھلے دروازے سے دوڑتے ہوئے باہر نکل گئے۔ تبھی باغیچے میں ساتھ والے بنگلے کی طرف کی جھاڑیوں میں شگاف پڑ گیا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اجنبی اسی طرف گیا ہے۔ دونوں تیزی سے ادھر ہی کو دوڑے۔ باڑ کو پار کرتے ہی انہوں نے کسی شخص کو اگلے بنگلے کی دیوار پھلانگتے ہوئے دیکھا۔ وہ بھی چھلانگ لگا کر ہمسائے کے باغیچے میں گھس گئے۔ عمار بھائی سے چند قدم آگے تھا۔ اس نے مشتبہ آدمی کو جا لیا اور اسے پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھا کر لپکا مگر وہ بجلی کی طرح تڑپ کر دیوار کے پار ہو گیا اور عمار ہوا میں مٹھی بند کیے منہ کے بل کچے فرش پر گر پڑا۔

عامر نے تعاقب جاری رکھا۔ اس نے تیسرے بنگلے کے باغیچے کی دیوار پر سے بھگوڑے کو پکڑ کر نیچے کھینچ لیا۔ دو تین منٹ دونوں میں کشتی ہوتی رہی اور پھر وہ عامر کے شکنجے سے چھوٹ کر چند قدم دور جا کھڑا ہوا۔ اس وقت چاند کا ذرا سا کنارہ بادلوں میں سے نکلا، جس کی چمکیلی روشنی میں عامر کو اس کا بھیانک سفید چہرہ اور حلقوں میں دھنسی ہوئی آنکھیں چمکتی نظر آئیں۔ عین اسی وقت اس دہشت ناک آدمی نے جیب سے پچکاری جیسی کوئی چیز نکال کر عامر کے منہ پر اسپرے پھینکا، جس سے اس کی آنکھوں میں مرچیں سی لگ گئیں۔ اتنے میں عمار آ پہنچا۔

"عامر! تم ٹھیک تو ہو نا؟" عمار نے گھبرا کر پوچھا۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟ جلدی کرو... وہ بچ کر نکل جائے گا۔" عامر نے دوڑتے ہوئے کہا۔

دونوں بھائی دیوار پھاند کر گلی میں اُترے ہی تھے کہ دو بنگلے چھوڑ کر تیسرے بنگلے کے گیٹ پر کار اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ عامر بجلی کی طرح لپک کر پہنچا اور جیسے ہی جھپٹ کر دروازہ کھولا، کار کی لائٹیں جل اُٹھیں۔ دونوں بھائی مارے حیرت اور ندامت کے دم بخود رہ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ان کے ہمسائے کی بیگم بیٹھی ہوئی تھیں جو انہیں دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"عامر! عمار! کیا بات ہے؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔" انہوں نے چیخ کر کہا۔

"جی، معاف کیجیے گا۔ ہم ایک آدمی کو ڈھونڈ رہے تھے۔"

عامر نے معذرت کی۔

''وہ زومبی تو نہیں ہے، مگر بخدا اس کا چہرہ واقعی کسی لاش کی طرح بھیانک اور ڈراؤنا ہے۔ پھوپھی منصورہ کا دہشت زدہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔'' گھر کی طرف جاتے ہوئے عامر کہہ رہا تھا۔ گھر پہنچے تو ان کی امی، پھوپھی اور چچی کو تسلی دے رہی تھیں۔ وہ ابھی تک دہشت زدہ تھیں۔

''وہ بھاگ گیا۔'' عمار نے باورچی خانے میں گھستے ہی کہا۔ پھر انہوں نے ڈرائنگ روم میں آکر امجد کو اپنی ناکام مہم کا حال سنایا۔ اتنے میں پھوپھی منصورہ کمرے میں داخل ہوئیں اور بولیں: ''دیکھو لڑکو! یہ پُراسرار عجوبہ، جس کا تم تعاقب کر رہے ہو، چاہے زومبی ہو یا نہ ہو، انتہائی خطرناک شخص ضرور ہے۔ تمہیں اس سے دُور ہی رہنا چاہیے۔ یہاں پردیس میں تمہیں کیا ضرورت ہے کسی الجھن میں پڑنے کی؟''

''آپ فکر نہ کریں، ہم ہر کام احتیاط سے کرتے ہیں۔ اب تو ہم نے امجد سے وعدہ کرلیا ہے۔ یہ کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ آخر یہ بھی ہمارا پاکستانی بھائی ہے۔'' عامر نے کہا۔

اتنے میں صدر دروازے کی گھنٹی بجی اور چند لمحے بعد ملازم نے اندر آکر کسی ملاقاتی کے آنے کی اطلاع دی۔

''انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔'' عامر نے کہا۔

لڑکے ڈرائنگ روم میں آئے تو ایک دراز قد، دبلا پتلا آدمی جس نے چشمہ لگا رکھا تھا، ان کا منتظر تھا۔ انہیں دیکھ کر وہ آنکھیں جھپکتا ہوا کھڑا ہو گیا اور بولا:

''میرا نام جان ٹارسکی ہے۔ میں ایک سرکس کا ڈائریکٹر ہوں۔ مجھے آپ کے والد صاحب سے ملنا تھا مگر افسوس کہ دیر سے پہنچا۔ ملازم نے بتایا کہ وہ پاکستان چلے گئے ہیں۔ لڑکوں نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا۔

''آپ تشریف رکھیے اور یہ بتایئے کہ آپ والد صاحب سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟'' عمار نے پوچھا۔

اجنبی جلدی جلدی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولا: ''جیسا کہ میں

نے بتایا، میں ٹاپ اسٹار سرکس کا ڈائریکٹر ہوں۔''

''ہم کئی بار آپ کا سرکس دیکھ چکے ہیں۔'' عمار نے بات کاٹ کر کہا۔

''جی ہاں، ضرور دیکھ چکے ہوں گے مگر بدقسمتی سے میری آپ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ہاں تو، میں کہہ رہا تھا کہ کچھ عرصے سے میرے سرکس میں عجیب و غریب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ ان کی نوعیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اتفاقیہ حادثات نہیں ہیں، بلکہ ان کے پیچھے کسی کا ہاتھ ہے۔''

''مثلاً.....؟'' عامر نے دل چسپی سے پوچھا۔

''ایک منظر میں گھوڑوں کی ننگی پشت پر سوار ہو کر چند شہسوار کرتب دکھاتے ہیں۔ ان میں ایک لڑکی بھی ہے۔ گزشتہ ہفتے لڑکی کا گھوڑا گر گیا اور لڑکی کو سخت چوٹیں آئیں۔ شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ جس دائرے میں گھوڑے چکر لگاتے ہیں، وہاں ایک گڑھا کھود کر اس میں لکڑی کا برادہ بھر دیا گیا تھا۔ گھوڑے کا پاؤں اس گڑھے میں پھنس گیا۔ پھر ایک اور خطرناک منظر ہے۔ بہت بلندی پر ایک لڑکی تار کے اوپر چلتی ہے۔ کل رات وہ عین درمیان میں پہنچی تو تار ٹوٹ گیا۔ اگر اس نے

گرتے گرتے نیچے کے فریم کے ایک تار کو جھپٹ کر پکڑ نہ لیا ہوتا تو اس کے بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تار کا جو سرا ٹوٹا تھا، اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے ریتی سے رگڑ رگڑ کر گھسا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی چھوٹے موٹے واقعات ہوتے رہے ہیں۔ کبھی لباس چوری ہو جاتے، کبھی عین کھیل کے دوران لائٹ فیل ہو جاتی مگر اب تو مہلک قسم کی شرارتیں ہونے لگی ہیں۔ میں بے حد ہراساں ہو گیا ہوں۔ کوئی دشمن، کمپنی کو بدنام کرنے کے لیے یہ ہتھکنڈے استعمال کر رہا ہے۔'' بات ختم کر کے اس نے آنکھیں جھپک جھپک کر لڑکوں کے تاثرات کا جائزہ لینا شروع کیا۔

''آپ نے پولیس کو اطلاع نہیں دی؟'' عامر نے پوچھا۔

''دی کیوں نہیں..... پولیس کا بھی یہی خیال ہے کہ ان واقعات کے پیچھے کسی کی شرارت ہے۔ وہ کہتی ہے کہ ہمیں کسی ایسے سراغ رساں کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں جو کمپنی کے اسٹاف میں رہ کر مجرم کو پکڑے۔''

''مسٹر ٹارسکی، اگر ہم اس سے پہلے اپنے اس دوست کی مدد کا وعدہ نہ کر چکے ہوتے تو بڑی خوشی سے آپ کا کیس لے لیتے۔ ان کو ایک مسئلہ درپیش ہے، جس کے لیے یہ ہمارے پاس آئے ہیں۔ ہم کل ہی ان کے ساتھ 'توجا' جا رہے ہیں۔'' عمار نے کہا۔

''واہ! پھر تو بات بن گئی۔ میرا سرکس بھی وہیں جا رہا ہے۔ آپ دونوں کیس ایک ساتھ نپٹا سکتے ہیں۔'' ٹارسکی کہنے لگا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، آپ ہم پر اعتماد کریں۔ ہمیں امید ہے کہ ہم آپ کے مجرم کو پکڑ لیں گے۔'' عمار نے جوش میں آ کر وعدہ کر لیا۔ پھر بھائی سے پوچھا۔ ''کیوں عامر؟''

عامر نے ہنس کر سر ہلایا اور بولا: ''اب مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ وعدہ تو تم نے کر ہی لیا مگر میں حیران ہوں کہ ہم لوگ سرکس میں کیا کام کریں گے؟''

''ہم پریس رپورٹروں کی حیثیت سے سرکس کے فن کاروں کا انٹرویو لیں گے'' عمار نے جواب دیا۔ مسٹر ٹارسکی نے بھی یہ تجویز پسند کی۔

اگلے دن صبح ہی تینوں لڑکے توجا روانہ ہو گئے۔ عامر نے چچا سے رات ہی کو گاڑی لے جانے کی اجازت لے لی تھی۔ وہ بیماری کے باعث گھر ہی رہتے تھے، اس لیے انہیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ امجد کو انہوں نے راستے میں کلب ہاؤس میں اتارا کیوں کہ وہ کسی ڈرامے کی ریہرسل کر رہا تھا اور ان کے ساتھ اپنے بنگلے تک نہیں جا سکتا تھا۔

''میں کلب سے اپنے دوست ٹوگو کو بھی فون کر دوں گا۔ اگر وہ آج ڈرامے کی ریہرسل کے لیے نہیں آیا تو آپ کے پاس آ جائے گا۔ مجھے رات کی غیر حاضری کے متعلق ابو کے دوست کو بھی بتانا ہے۔ وہ فکر کر رہے ہوں گے۔ انہیں بھی فون کر دوں گا۔'' امجد نے بنگلے کی چابیاں عامر کے سپرد کرتے ہوئے کہا۔

عامر نے کلب کی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ایک مقامی وکیل کا فون نمبر تلاش کیا اور فون پر اس سے ملاقات کا وقت لے لیا۔

بقیہ: آپ بھی لکھیے

یہ سن کر بادشاہ بہت اداس ہوئے اور کہنے لگے: ''یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ مجھے تو ہزار بار چھینک آئی ہے۔''

بیربل نے تپتے ہوئے لوہے پر ضرب لگائی اور کہا: ''تو پھر ملا دو پیازہ کو بلا لیجیے، شاید انہوں نے کبھی نہ چھینکا ہو۔'' اس وقت قاصد بھیج کر ملا دو پیازہ کو بلایا گیا۔ ساری بات سن کر ملا نے کہا: ''جہاں پناہ! چھینک تو ایسی چیز ہے کہ روکے نہیں رکتی۔ میں بھی کئی بار چھینک چکا ہوں۔''

بادشاہ اکبر یہ بات سن کر اور بھی اداس ہو گئے۔ بیربل نے کہا: ''حضور! پریشان نہ ہوں۔ محل میں شہزادوں، بیگمات یا دوسرے سرداروں یا پھر فوجیوں میں سے کوئی نہ کوئی تو مل ہی جائے گا جس نے کبھی چھینکا نہ ہو۔''

دن بھر ایسے شخص کی تلاش ہوتی رہی مگر کوئی آدمی ایسا نہ مل سکا۔ بادشاہ نے تنگ آ کر آخر بیربل سے پوچھا: ''اب تم ہی بتاؤ کہ کیا کیا جائے۔ میں جلد از جلد موتیوں کی فصل کاٹ کر اپنے خزانوں کو سچے موتیوں سے بھرنا چاہتا ہوں۔''

بیربل نے جواب دیا: ''تو پھر شہزادوں، شہزادیوں، بیگمات، درباریوں اور سب نوکروں اور سپاہیوں کو محل سے باہر نکال دیجیے۔''

''کیا مطلب؟'' بادشاہ نے برہم ہو کر پوچھا۔

''کیوں کہ تمام لوگوں کو چھینک آتی ہے اور ایک میں نے بھرے دربار میں چھینک دیا تھا تو کون سا گناہ کیا تھا جو مجھے دربار سے باہر نکال دیا گیا۔''

یہ سن کر بادشاہ فوراً معاملے کو سمجھ گئے۔ مسکرا کر بیربل کو معاف کر دیا اور یوں بیربل کو ایک بار پھر بادشاہ کے مصاحبوں میں جگہ مل گئی۔ ☆

نافرمانی کی سزا

عاطر شاہین

ریحان کی عمر پندرہ سال تھی۔ اس کا تعلق امیر گھرانے سے تھا۔ اس کے والد شہر کے معروف بزنس مین تھے۔ ریحان ایک ضدی بچہ تھا۔ جس چیز کی ضد کر لیتا، وہ اسے ہر صورت میں منوا کر رہتا تھا۔ آج بھی وہ کافی دیر سے اپنی امی سے موٹر سائیکل چلانے کی ضد کر رہا تھا مگر امی اس کی بات مان کے نہیں دے رہی تھیں۔

''امی! پلیز مجھے موٹر سائیکل چلانے دیں۔ آپ یقین کریں مجھے موٹر سائیکل چلانی آتی ہے۔'' ریحان نے کہا۔

''ریحان بیٹا! ابھی آپ بہت چھوٹے ہو۔ آپ کی عمر موٹر سائیکل چلانے کی نہیں ہے۔ جب آپ بڑے ہو جاؤ گے تو پھر موٹر سائیکل چلانا۔'' امی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی! مجھ سے چھوٹی عمر کے بچے موٹر سائیکلیں چلاتے پھر رہے ہیں۔ انہیں تو ان کے والدین نہیں روکتے مگر آپ مجھے روک رہی ہیں۔'' ریحان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''میں ان بچوں کے والدین کو قصور وار قرار دوں گی۔ بچوں کی ہر خواہش پوری نہیں کرنی چاہیے۔ جانتے ہو پچھلے ہفتے شہزاد کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ اس نے بھی موٹر سائیکل چلانے کی کوشش کی تھی اور گدھا گاڑی سے ٹکرا گیا تھا۔'' امی نے کہا۔

''امی! شہزاد کو تو موٹر سائیکل چلانی ہی نہیں آتی تھی، اس لیے ایکسیڈنٹ ہو گیا مگر میں تو سیکھا ہوا ہوں۔'' ریحان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں، آپ جھوٹ بول رہے ہو۔ آپ کو موٹر سائیکل چلانی نہیں آتی، لہٰذا میں آپ کو موٹر سائیکل نہیں دوں گی۔'' اس کی امی نے حتمی لہجے میں کہا تو ریحان کا منہ بن گیا۔

''امی پلیز، صرف ایک بار موٹر سائیکل چلانے کی اجازت دے دیں، پھر نہیں کہوں گا۔'' ریحان نے امی کی منتیں کرتے ہوئے کہا۔

''سوری بیٹا! میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دے سکتی۔'' امی نے ذرا سختی سے کہا۔

ریحان اپنے کمرے میں آ گیا اور موٹر سائیکل باہر لے جانے کی ترکیب سوچنے لگا۔ اسے موٹر سائیکل چلانے کا بہت شوق تھا۔ اپنے اس شوق کی خاطر اس نے موٹر سائیکل چلانی اپنے دوست سجاد سے سیکھ لی تھی۔ وہ موٹر سائیکل اتنی تیز رفتاری سے چلاتا تھا کہ جیسے ہوا سے باتیں کر رہا ہو۔ اسے تیز رفتاری سے موٹر سائیکل چلانے میں مزہ آتا تھا۔

ریحان آٹھویں کے امتحان سے فارغ تھا اس لیے اسے اسکول سے چھٹیاں تھیں۔ جب کوئی ترکیب اس کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ دوبارہ امی کے کمرے میں آیا تا کہ امی سے اپنی بات منوا سکے۔ اس کی امی کمرے میں نہ تھیں۔ سامنے میز پر موٹر سائیکل کی چابی پڑی ہوئی تھی۔ چابی دیکھ کر ریحان کے چہرے پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس

نے جلدی سے چابی اُٹھائی اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ پورچ میں کھڑے موٹر سائیکل کو اس نے جلدی جلدی باہر نکالا تاکہ اس کی امی نہ آجائیں۔ پھر موٹر سائیکل پر سوار ہونے کے بعد اسے اسٹارٹ کیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے موٹر سائیکل آگے بڑھا دی اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ ریحان موٹر سائیکل بہت تیز رفتاری سے چلا رہا تھا۔ خوشی کے مارے اسے اردگرد کا ذرا بھی ہوش نہ تھا۔

دوسرے موڑ پر ریحان موٹر سائیکل تیز رفتاری سے موڑنے لگا تو اچانک اس کے سامنے ایک لڑکا آ گیا۔ لڑکے کو دیکھ کر ریحان گھبرا گیا اور اس نے موٹر سائیکل سنبھالنے کی کوشش کی لیکن لڑکے کو موٹر سائیکل کی اتنی زوردار ٹکر لگی کہ وہ اُچھل کر دُور جا گرا اور اس کے ہاتھ میں موجود کتابیں اِدھر اُدھر گر گئیں۔ ریحان بھی موٹر سائیکل نہ سنبھال سکا تھا، اس لیے وہ بھی ایک مکان کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اسے بھی چوٹیں آئیں تھیں۔ ریحان اُٹھا اور زخمی لڑکے کی طرف بڑھا جو اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا۔ ریحان نے لڑکے کو سیدھا کیا اور اسے دیکھنے لگا۔

لڑکے کی پیشانی پر زخم آیا جس سے خون نکل رہا تھا۔ شلوار گھٹنے سے پھٹ گئی تھی اور گھٹنا خون آلود ہو گیا تھا۔ وہ لڑکا زخموں کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ ریحان کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس نے قرب وجوار میں دیکھا مگر گرمیوں کی وجہ سے گلی سنسان پڑی ہوئی تھی۔ ریحان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کی غفلت اور تیز رفتاری کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آ سکتا ہے۔

''اُف خدایا، یہ مجھ سے کیا ہو گیا ہے۔'' ریحان نے پریشان لہجے میں کہا۔

پچھتاوے نے اسے آ گھیرا تھا۔ وہ اکیلا اس بے ہوش اور زخمی لڑکے کو اسپتال نہ لے جا سکتا تھا۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اچانک اس طرف اس کا دوست سجاد آ نکلا۔ سجاد نے جب اس زخمی لڑکے کو دیکھا تو وہ تیزی سے ان کے پاس آ گیا۔

''اللہ کا شکر ہے کہ تم آ گئے ہو۔''

''ریحان، کون ہے یہ اور زخمی کیسے ہوا ہے؟'' سجاد نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہ لڑکا میری موٹر سائیکل سے ٹکرا گیا تھا۔'' ریحان نے کہا۔

''یقیناً تم موٹر سائیکل تیز رفتاری سے چلا رہے ہو گے؟'' سجاد نے کہا۔

''اوہ... یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔ لڑکے کی حالت بہت خراب ہے۔ اسے اسپتال پہنچانے میں میری مدد کرو۔'' ریحان نے جھنجھلا کر کہا۔

''میرا خیال ہے میں ایمبولینس کو فون کر دوں۔'' سجاد نے کہا۔

''نہیں، ایمبولینس کو یہاں تک پہنچنے میں کافی دیر ہو جائے گی۔ اس لڑکے کا خون نکل رہا ہے ایسا نہ ہو کہ اس کی حالت مزید خراب ہو جائے۔'' ریحان نے جواب دیتے ہوئے کہا۔

''تم موٹر سائیکل یہاں لے آؤ۔'' سجاد نے کہا تو ریحان اُٹھا اور اپنی گری ہوئی موٹر سائیکل لے آیا۔ پہلے ریحان نے لڑکے کی زمین پر بکھری کتابیں اُٹھا کر موٹر سائیکل کے سائیڈ بیگ میں ڈالی، پھر دونوں نے زخمی اور بے ہوش لڑکے کو اُٹھایا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر سجاد کے ابو کے پرائیویٹ اسپتال کی طرف بڑھ گئے۔ اسپتال کے گیٹ پر اسٹریچر موجود تھا، اس لیے زخمی لڑکے کو اسٹریچر پر ڈال کر ریحان اسے ایمرجنسی وارڈ میں لے گیا جب کہ سجاد اپنے ابو کو بلانے چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے ابو اور دو نرسیں آ گئیں اور زخمی لڑکے کی ٹریٹمنٹ شروع ہو گئی۔ جب زخمی لڑکے کے زخموں کی پٹی کر دی گئی تو سجاد کے ابو، ریحان اور سجاد کو لیے اپنے کمرے میں آ گئے۔

''سجاد، یہ حادثہ کیسے پیش آیا؟'' اس کے ابو نے پوچھا۔ سجاد نے ریحان کی طرف دیکھا تو ریحان نے اشارہ کیا کہ وہ اس کا نام نہ لے۔

''ابو! اس لڑکے کو کسی کار والے نے ٹکر مار دی تھی۔ ہم جب وہاں پہنچے تو کار والا فرار ہو چکا تھا اور ہم اسے یہاں لے آئے۔'' سجاد نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''انکل، اب اس لڑکے کی حالت کیسی ہے؟'' ریحان نے پوچھا۔

''اب اس لڑکے کی حالت بہتر ہے۔ اگر زیادہ خون بہہ جاتا تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔'' سجاد کے ابو نے کہا تو ریحان کی جان میں جان آئی اور وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس لڑکے کی جان چلی جاتی تو پھر کیا ہوتا۔ یہ سوچ کر وہ جھرجھری لے کر رہ گیا۔

''سجاد بیٹا، جانتے ہو وہ لڑکا کون ہے؟''

''نہیں ابو۔''

''ہوش میں آئے گا تو وہ اپنے بارے میں بتائے گا۔''

''انکل، وہ لڑکا کب تک ہوش میں آجائے گا۔'' ریحان نے پوچھا۔

''بیٹا! اُمید ہے کہ جلد ہی ہوش میں آ جائے۔'' سجاد کے ابو نے

کہا۔ ابھی وہ بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ اسی لمحے ایک نرس اندر آئی۔
''ڈاکٹر صاحب، ایک ایمرجنسی کیس آیا ہے۔'' نرس نے کہا۔
''اچھا!'' انہوں نے کہا اور وہ نرس کے ساتھ کمرے سے چلے گئے۔
''سجاد، اس کی کسی کتاب پر ضرور اس کا نام اور پتا لکھا ہو گا۔ میں اس کی کتابیں لے آتا ہوں۔'' ریحان نے کہا اور پھر وہ اُٹھ کر پارکنگ میں آ گیا جہاں اس کا موٹر سائیکل موجود تھا۔ ریحان نے سائیڈ بیگ سے زخمی لڑکے کی کتابیں نکالیں اور انہیں لے کر سجاد کے ابو کے کمرے میں آ گیا۔
''یہ لو..... تم اس کتاب کو دیکھو، میں دوسری دیکھتا ہوں۔'' ریحان نے ایک کتاب سجاد کو دیتے ہوئے کہا اور پھر وہ دوسری کتاب کھول کر دیکھنے لگا۔
''کتاب پر بلال نام لکھا ہوا ہے۔'' سجاد نے کہا۔
''ہاں، اس کتاب میں بھی یہی نام ہے۔''
''لیکن اس کے گھر کا ایڈریس نہیں لکھا۔'' سجاد نے بتایا۔
سجاد اور ریحان نے باقی کتابیں بھی چیک کیں تو ان پر بھی صرف نام درج تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد سجاد کے ابو کمرے میں واپس آ گئے۔
''بچو! زخمی لڑکے کو ہوش آ گیا ہے۔'' سجاد کے ابو نے بتایا تو وہ دونوں چونک پڑے۔
''ابو، کیا ہم اس سے مل سکتے ہیں؟'' ''ہاں!'' ابو نے کہا۔
''آؤ ریحان۔'' سجاد نے کہا اور پھر وہ دونوں کمرے سے نکل کر اس کمرے میں آ گئے جہاں زخمی لڑکا بلال بیڈ پر نیم دراز تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور اس کی حالت پہلے سے کافی بہتر دکھائی دے رہی تھی۔
''تم وہی ہو ناں جس نے مجھے موٹر سائیکل سے ٹکر ماری تھی۔'' بلال نے ریحان کو پہچان کر کہا۔
''ہاں، مجھے معاف کر دو بھائی! میری وجہ سے تم زخمی ہوئے ہو۔'' ریحان نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔
''میرے بھائی، جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں لیکن میری ایک گزارش ہے کہ اگر تمہیں موٹر سائیکل چلانے کا شوق ہے تو بے شک اپنا شوق پورا کرو لیکن اپنے اس شوق سے دوسروں کا نقصان نہ کرو۔ موٹر سائیکل آہستہ چلاؤ۔ خاص طور پر گلیوں میں کیوں کہ گلیوں میں چھوٹے معصوم بچے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ بزرگ پیدل جا رہے ہوتے ہیں۔ تیز رفتاری سے کوئی خوفناک حادثہ بھی پیش آ سکتا ہے۔'' بلال نے کہا تو ریحان نے شرمندگی سے سر جھکا لیا اور اس نے اسی وقت عہد کر لیا کہ وہ بلال کی باتوں پر عمل کرے گا۔ تھوڑی دیر کے بعد بلال کو ڈسچارج کر دیا گیا اور وہ اپنی کتابیں لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا جب کہ ریحان اور سجاد موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اپنے گھر کی طرف بڑھ گئے۔ سجاد کا گھر پہلے آتا تھا اس لیے وہ راستے میں ہی اُتر گیا جب کہ ریحان اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔
موٹر سائیکل کی حالت بھی خراب ہو چکی تھی۔ دائیں سائیڈ والا اشارہ ٹوٹ چکا تھا جب کہ پٹرول کی ٹینکی پر رگڑیں لگ گئی تھیں۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر ریحان نے گھنٹی بجائی تو ملازم نے دروازہ کھولا۔ موٹر سائیکل صحن میں کھڑی کر کے ریحان اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ سٹنگ روم میں اس کی امی موجود تھیں۔
''ریحان، ادھر آؤ۔'' امی نے سخت لہجے میں اس سے کہا۔
ریحان رُکا اور ڈرتے ڈرتے اپنی امی کے پاس آیا۔ اسے اس بات کا ڈر لگ رہا تھا کہ شاید اس کی امی کو حادثے کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔ اس کی امی اس کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔
''کہاں سے آ رہے ہو؟'' امی نے پوچھا۔
''وہ..... سجاد سے ملنے گیا تھا۔'' ریحان نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔
''آخر آپ میری عدم موجودگی میں موٹر سائیکل لے ہی گئے تھے۔ آپ کے کپڑے بھی مٹی دھول سے اٹے ہوئے ہیں۔ کہیں آپ نے کوئی نقصان تو نہیں کیا؟'' امی نے پوچھا۔
''دراصل راستے میں موٹر سائیکل پتھر سے ٹکرا گیا تھا۔'' ریحان نے نظریں نیچے کیے کہا۔
''آپ جھوٹ بول رہے ہو ریحان۔'' اس کی امی نے کہا تو ریحان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ ''یاد رکھو جو بچے والدین کا کہا نہیں مانتے وہ ہمیشہ نقصان اُٹھاتے ہیں۔'' امی نے کہا۔
''مجھے معاف کر دیں امی، مجھ سے غلطی ہو گئی تھی۔ آج میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بھی ضد نہیں کروں گا اور آپ کی بات مانوں گا۔ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں نے آپ کی بات نہ مان کر نقصان اُٹھایا ہے۔'' ریحان نے سر جھکا کر کہا تو امی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے پیار کرنے لگیں۔
''والدین کا کہنا ماننے میں ہی عافیت ہے۔ ہر والدین اپنی اولاد کی بھلائی چاہتے ہیں۔'' امی نے کہا اور ریحان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

پرندے کی فریاد

(ثمرہ احمد، ڈسکہ)

بہت پرانے وقتوں کی بات ہے کہ کسی آدمی نے ایک خوب صورت رسیلی آواز والے پرندے کو قید کر لیا۔ پرندہ خوب صورتی کی وجہ سے قید ہو گیا۔ پیارے بچو! کبھی آپ نے کوے یا چیل کو بھی قید دیکھا ہے؟ نہیں ناں، کیوں کہ نہ وہ خوب صورت رنگوں بھرے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی آواز کان کو بھاتی ہے۔ اب پرندے کو آدمی طرح طرح کے پھل ڈالتا، صاف ستھرا رکھتا مگر دل ہی دل میں پرندے کو اپنا وطن اور شجر یاد آتے، جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ڈال ڈال منڈلاتا پھرتا۔ اپنے دوستوں کے سنگ اُڑانیں بھرتا، باغ کی بہاروں میں جب بھنورے پھولوں کا رس چوستے، شہد کی مکھیاں معطر خوشبودار ہواؤں میں اُڑتیں اور میووں کے رس کشید کر کے شہد تیار کرتیں۔ تتلیاں شاخ در شاخ رقص کرتیں، کوئلیں، بلبلیں خدا کی محبت کے ترانے گاتیں تو اس کا دل کٹ کٹ جاتا۔ درد کے مارے آنسو نکل پڑتے۔ یہ ہجر، یہ جدائی، یہ قید، یہ تنہائی، یہ اداسی اسے غمگین کیے رکھتی۔ ادھر آدمی کا دل کرتا وہ ہر وقت اس کے لیے گیت گائے، اس کا من بہلائے۔ کچھ دن گزرے تو آدمی نے محسوس کیا، پرندہ اب بالکل خاموش رہنے لگا ہے۔ نہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے، شاید بیمار ہے۔ وہ اسے جانوروں، پرندوں کے ڈاکٹر کے پاس مطب میں لے کر گیا تو ماہر حیوانات نے بتایا یہ بالکل ٹھیک ہے، اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ آدمی سخت پریشان تھا مگر اسے آزاد کرنے کا اس کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ دن پر دن گزرنے لگے، پرندہ مزید اداس ہونے لگا۔ وہ ہر اس آواز سے محروم ہو چکا تھا جو اسے امید دلاتی تھی کہ آؤ کھلی ہواؤں میں اُڑو۔ بدنصیبی سے اسے کوئی راستہ نہ ملتا جہاں سے وہ اُڑ جائے۔ پنجرہ ہر وقت بند ہوتا اور پنجرے کے دروازے پہ تالا۔ درد کے مارے اس کے اپنے گیت بھی ختم ہونے لگے۔ خوب صورت آواز دکھڑے میں بدل گئی۔ اسے یہ غم ستانے لگا کہ اب میں کبھی آزاد فضا نہ دیکھ پاؤں گا اور یہیں سڑتا سڑتا مر جاؤں گا۔ اندھیرے میرا مقدر ہوں گے، آسمان کی وسعتیں خواب ہوں گی۔ آہ! الٰہی، میرا قصور معاف کر اور مجھے آزاد کر کے میری قید کو آزادی میں تبدیل فرما۔ رحم فرما، الٰہی رحم فرما۔ اللہ پاک اس ظالم آدمی کے دل میں نرمی پیدا فرما تاکہ یہ مجھے چھوڑ دے اور دعا حاصل کر لے۔ یہ فریاد بے بس پرندے کی عرش پہ گئی اور ایک دن آدمی نے سوچا کہ اگر مجھے کوئی اس طرح قید کر دے۔ میرے بیوی، بچے، بہن، بھائی، عزیز، رشتہ دار سب بچھڑ جائیں اور تنہائی میں دیواروں سے فریاد کر کر کے میں ختم ہو جاؤں تو میرا کیا بنے گا۔ یہ خیال اسے آنا تھا کہ اس کے دل میں پرندے کی اداسی کی تمام وجہ سمجھ میں آ گئی۔ وہ اسی گاؤں کی طرف چل پڑا جہاں سے اس نے پرندے کو پکڑ کر قید کیا تھا اور تالا کھول کر پنجرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور کہنے لگا، اے اللہ پاک! مجھے معاف کر دے، میں پرندے کی فریاد نہ سمجھ سکا۔ اسے آزاد کر کے مجھے بھی مصیبتوں، پریشانیوں سے آزادی عطا فرما۔ پرندہ تیزی سے باہر نکلا اور اُڑ کر درخت پر جا بیٹھا اور اپنے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اس بے بس کی فریاد سنی اور آدمی کے دل میں رحم ڈالا۔ پرندے کو آزاد دیکھ کر آدمی نے بھی سکھ کا سانس لیا اور اپنے گھر کی راہ لی۔

نتیجہ: سچ ہے اللہ کریم کسی بے بس کی فریاد رائیگاں نہیں کرتا۔

'بھنڈی' سے 'کیپٹن' تک

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

(محمد زبیر ارشد، سیال کوٹ)

سخت سردی کی رات تھی اور وہ چادر اوڑھے کتاب لیے اپنے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ اسے اونگھ آ رہی تھی مگر اس کا کام ابھی مکمل نہ ہوا تھا۔ اس کی ماں بھی اس کے ساتھ جاگ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے ماں اس کو آواز دے دیتی تاکہ اس کی آنکھ نہ لگ جائے۔ وہ بچہ وقار اب نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کا والد ایک غریب آدمی تھا جس کا نام محمود تھا۔ ماں کچھ پڑھی لکھی تھی لیکن اتنا کچھ نہ جانتی تھی۔ وہ بچپن ہی سے جب اسکول جاتا تو لڑکے اسے ''بھنڈی'' کہہ کر تنگ کرتے تھے۔ یہ حقیقت تھی

کہ وہ دبلا پتلا اور لمبا تھا لیکن اسے اس نام سے بے حد نفرت تھی۔ گھر آتا تو روتا اور ماں سے گلے کرتا۔ ماں اسے دلاسے دیتی اور کہتی بیٹا دنیا کا تو کام ہی یہ ہے اوروں کو ستانا۔ تو محنت کیا کر اور لوگوں کی باتوں پر دھیان نہ دیا کر۔ خدا نے چاہا تو لوگوں کا منہ خود بخود بند ہو جائے گا۔ اس کی جماعت میں دو لڑکے علیم اور اسامہ اسے دوسروں کی نسبت زیادہ تنگ کرتے تھے لیکن اس نے اپنی ماں کی بات پلے باندھ لی تھی۔ وہ ان کی باتوں پر ذرا دھیان نہ دیتا تھا۔ جب آٹھویں جماعت میں اس کی چوتھی پوزیشن آئی تھی تو علیم اور اسامہ نے اسے بہت تنگ کیا تھا اور وقار بھنڈی، وقار بھنڈی کہہ کر اسے چڑاتے تھے۔ آٹھویں جماعت کے رزلٹ کے بعد کا منظر اس کے ذہن میں گھوم رہا تھا۔ جب علیم اور اسامہ اسے تنگ کرتے تھے کہ دیکھو ''بھنڈی'' چوتھی پوزیشن پر آیا ہے۔ آج اسی سوچ سے وہ رات دس بجے تک جاگ کر امتحان کی تیاری میں مصروف تھا۔ سوچتے سوچتے اس کو آدھا گھنٹہ گزر گیا۔ پھر اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے ابھی پڑھنا ہے۔ اس کا صبح فزکس کا پرچہ تھا۔ اس کا صرف ایک باب دہرانے والا رہ گیا تھا۔ وہ پھر پڑھنے لگ گیا اور پڑھتے پڑھتے نجانے اس کی کب آنکھ لگ گئی۔ اللہ اللہ کر کے آخرکار امتحان گزر گئے۔ وقت پر لگا کر اُڑتا گیا اور نتیجے کا دن آ گیا۔ اس کا باپ صبح تڑکے سے ہی دوسرے گاؤں جہاں نتیجہ آنا تھا، جا کر بیٹھ گیا۔ قریباً بارہ بجے وہ گھر لوٹا۔ اس کی خوشی دیدنی تھی، اس نے دروازے سے ہی پکارا ''وقار، وقار.....'' وقار آیا تو اس کے باپ نے بتایا کہ وہ اسکول میں ہی نہیں بلکہ پورے علاقے میں اوّل آیا ہے۔ وقار کی محنت اور اس کے ماں باپ کی دعائیں رنگ لائیں تھیں۔ اب ''وقار بھنڈی'' والا نظریہ پہلے کی نسبت مدہم ہو گیا تھا۔ پھر دسویں جماعت کے بعد اس کا اپنے اسکول سے رابطہ کٹ گیا۔ اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا اور اعلیٰ تعلیم کے بعد اس نے آرمی جوائن کر لی۔ پانچ سال کے بعد وہ وقار بھنڈی سے کیپٹن وقار بن گیا۔ خدا کی قدرت علیم اور اسامہ بھی آرمی میں بطور صوبیدار بھرتی ہو گئے۔ وقار کا معاشرے میں عزت و وقار بڑھ چکا تھا۔ وہ جب بھی علیم اور اسامہ کے سامنے سے گزرتا تو وہ اسے سلیوٹ مارتے تھے۔ اب وہ دونوں اسے بھنڈی نہیں بلکہ کیپٹن صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ ان دونوں کا غرور خاک میں مل چکا تھا۔ اگر وقار چاہتا تو ان کو نوکری سے برخاست کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اب وہ تینوں اچھے دوست بن چکے تھے۔ وقار نے ماں باپ اور خود کا وقار رکھ لیا تھا۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم خوب محنت کریں اور اگر کوئی ہمیں تنگ کرے تو بدلے میں اس کو خوش رکھنے کی کوشش کریں۔ بقول شاعر:

اپنے کردار کو رکھ مشعلِ شجر بنا کر
کوئی پتھر مارے تو اسے ثمر عطا کر

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

محنت کرے انسان تو کیا کچھ نہیں کر سکتا

(مقدس چوہدری، راولپنڈی)

عائشہ اور شاکر دونوں بہن بھائی تھے۔ وہ دونوں ہم عمر ہونے کے ساتھ ساتھ ہم جماعت بھی تھے۔ وہ دونوں ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ ان کے سالانہ امتحانات سر پر تھے۔ وہ دونوں بہت ذہین تھے۔ ہمیشہ کی طرح ان کو یقین تھا کہ پہلی پوزیشن کے حق دار وہی ہوں گے۔ وقت گزرتا گیا اور امتحان اور قریب آ گئے۔ صبح ان کا پہلا پرچہ تھا۔ شاکر اپنے دوست سے ریاضی کا سوال پوچھنے اس کے گھر گیا۔ شاکر جب اپنے دوست وہاب کے گھر گیا تو وہ ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا تھا۔ شاکر نے وہاب سے پوچھا: ''تم نے پرچے کی تیاری کر لی؟'' وہاب نے جواب دیا۔ ''مجھے تیاری کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرے پاس جادوئی ٹوپی جو ہے۔'' شاکر نے کہا: ''جادوئی ٹوپی!'' وہاب نے کہا۔ ''ہاں! جادوئی ٹوپی۔'' شاکر نے کہا: ''اس جادوئی ٹوپی کو پہننے سے انسان جو کچھ کرے وہ نظر نہیں آتا۔'' شاکر نے کہا۔ ''واہ...... واہ! کیا کمال کی چیز ہے جادوئی ٹوپی، کیا یہ جادوئی ٹوپی مجھے مل سکتی ہے؟'' وہاب نے کہا۔ ''ہاں، ضرور۔'' وہاب نے شاکر کو وہ جادوئی ٹوپی دے دی۔ ''اب میں چلتا ہوں، امی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' شاکر نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ وہ بہت خوش تھا، وہ گھر گیا اور سونے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ عائشہ بولی۔ ''شاکر تم نے پرچے کی تیاری کر لی ہے جو تم سونے لگے ہو؟'' شاکر بولا۔ ''ہاں! کر لی ہے، تم بھی کر کے سو جانا۔'' اور شاکر سو گیا جب کہ عائشہ پوری رات بیٹھ کر تیاری کرتی رہی۔ صبح عائشہ اور شاکر والدین کی دعاؤں

کے ساتھ گھر سے نکلے۔ پرچہ آٹھ بجے شروع ہوگیا۔ سب اپنا اپنا کام کرتے ہوئے دکھائی دیئے۔ شاکر نے وہ جادوئی ٹوپی پہنی اور جیب میں سے کتاب نکالی۔ ٹیچر شاکر کو کتاب نکالتے ہوئے دیکھ چکی تھیں۔ ٹیچر نے اس کا پرچہ لے لیا اور باقی پرچے دینے سے منع کر دیا جب کہ عائشہ کے امتحانات بہت اچھے ہوئے۔ آج نتیجے کا دن تھا۔ سب بچے خوب صورت ملبوسات میں اسکول کی طرف بھاگتے ہوئے آرہے تھے۔ آخر وہ گھڑی بھی آ گئی جس کا سب کو انتظار تھا اور ہمیشہ کی طرح عائشہ نے اوّل پوزیشن لی مگر یہ کیا، لڑکوں میں سے تو شاکر کے دوست وہاب نے پوزیشن لے لی۔ یہ دیکھ کر شاکر کو پتا چل گیا کہ وہ جادوئی ٹوپی کوئی جادو والی ٹوپی نہیں تھی بلکہ وہاب نے پہلی پوزیشن لینے کے لیے شاکر کے ساتھ جھوٹ بولا تھا۔ عائشہ کو اپنی محنت کا پھل مل گیا اور شاکر کو اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ اس نے عہد کر لیا کہ آئندہ وہ محنت کرے گا اور پوزیشن لے گا۔ ''محنت کرے انسان تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔'' بچو! آپ بھی عائشہ کی طرح محنت کریں اور اپنی جماعت میں اول پوزیشن لیجیے۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

خیانت

(صوفیہ عبداللہ، پشاور)

سلمان نے ایک غریب گھرانے میں آنکھ کھولی۔ سلمان کے والد ایک معمولی درجے کے سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے ہمیشہ سلمان کو حلال کھانے اور حرام سے بچنے کی تلقین کی تھی۔ وہ اسے بڑی مشکل سے ایک اچھے اسکول میں پڑھا رہے تھے۔ سلمان اب نویں جماعت میں تھا۔ اس نے آج تک کبھی والدین سے ایسی فرمائش نہیں کی تھی، جس سے ان کو پریشانی ہو یا قوتِ خرید سے باہر ہو۔

سلمان کی عمر اب چودہ برس ہو چکی تھی۔ اس کی جماعت میں بہت سے لڑکوں کے پاس موبائل فون تھے۔ اس نے اپنی ماں سے موبائل فون کا ذکر کیا لیکن اس کی ماں نے کہا: ''آج کل مہنگائی نے سب کی کمر توڑ رکھی ہے۔ گھر کا خرچ ہی بڑی مشکل سے پورا ہو رہا ہے۔ ان حالات میں تمہیں موبائل کہاں سے دلاؤں۔''

سلمان ان کے سامنے تو چپ ہو گیا مگر رفتہ رفتہ اس کے دل میں موبائل کی خواہش بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی امی جو پیسے اسے سودا سلف لانے کے لیے دیتیں، اس میں روزانہ وہ پانچ دس روپے بچا کر رکھ لیتا۔ اس کے والدین اس پر بھروسا کرتے تھے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا بیٹا ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ اسی طرح سلمان کے پاس تقریباً ایک ہزار روپے جمع ہو گئے تھے۔ ایک دن وہ جمعے کی نماز پڑھنے گیا تو امام صاحب خیانت کے موضوع پر وعظ کر رہے تھے۔ ان کے بیان نے سلمان کے دل پر بہت اثر کیا۔ وہ نماز پڑھ کر گھر آیا اور امی کو سب کچھ بتا دیا کہ اس کے پاس ہزار روپے کس طرح جمع ہوئے۔ اس کی امی نے ڈانٹا، پھر معاف کر دیا۔ اس کے ابو کو پتا چلا تو وہ بہت غصہ ہوئے لیکن پھر معاف کر دیا۔ اس دن سلمان بہت رویا۔ جب وہ صبح اُٹھا تو اسے اپنے بستر پر ایک ڈبا نظر آیا۔ ڈبا کھول کر دیکھا تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس میں ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ وہ بھاگا بھاگا امی ابو کے پاس پہنچا۔

''کیسا لگا تمہیں تحفہ؟'' اس کے ابو نے پوچھا۔ ''بہت اچھا، آپ کا شکریہ پاپا! آپ اس دنیا کے سب سے اچھے پاپا ہیں۔'' سلمان نے عہد کر لیا تھا کہ اب چاہے کچھ بھی ہو جائے، زندگی بھر امانت میں خیانت نہیں کرے گا۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

چوری کی سزا

(محمد حمزہ لغاری، میانوالی)

حسن ایک شرارتی بچہ تھا۔ اس کی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ ایک دن موسم بہت پیارا تھا۔

نیلگوں آسمان پر کالے بادلوں کا قبضہ تھا۔ وہ سب بہن بھائی صحن میں کرکٹ کھیل رہے تھے کہ یکا یک بوندا باندی شروع ہو گئی۔ وہ برآمدے میں بیٹھ کر بارش سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اتنے میں امی نے گرما گرم پکوڑے لا کر ان کے مزے کو دوبالا کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد بارش کا زور ٹوٹا۔ باہر سے حلوہ پوری بیچنے والے کی صدا آئی۔ حسن نے امی سے حلوہ پوری خریدنے کے لیے پیسے مانگے۔ امی کچن میں برتن دھوتے ہوئے پیار سے بولیں: ''بیٹا! ابھی تو آپ نے پکوڑے کھائے ہیں۔ فضول خرچی کرنے والا شیطان کا بھائی ہوتا ہے۔'' بات حسن کے سر سے گزر گئی۔ اس نے امی کو مصروف پا کر چپکے سے سب سے نظر بچا کر، امی کے پرس سے پچاس کا نوٹ نکالا اور گیٹ کی طرف

قدم بڑھا دیے۔ کیچڑ اور پانی کی وجہ سے وہ احتیاط سے چل رہا تھا۔ بہرحال گرتے پڑتے وہ حلوہ پوری والے کے پاس پہنچا۔ اپنا من پسند کھا جا لے کر وہ خوشی خوشی گھر میں داخل ہوا۔ اوہو! یہ کیا...... کیچڑ پر پاؤں پڑتے ہی وہ ایسا پھسلا کہ چاروں شانے چت زمین پر پڑا تھا۔ حلوہ پوری والا شاپر بھی پانی پر تیرتے ہوئے اس کا منہ چڑھا رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے گدلا پانی حلوہ پوری والے شاپر میں داخل ہو کر اسے ٹھینگا دکھا رہا ہو۔ اس کی چیخ سن کر امی اور سب گھر والے اس کی طرف دوڑے۔

کیچڑ میں لت پت دیکھ کر اس کے بہن بھائی اپنی ہنسی کنٹرول نہیں کر پا رہے تھے۔

امی نے اسے صاف کپڑے پہنائے اور پوچھا کہ آپ نے پیسے کہاں سے لیے تھے۔ حسن نے سچ بتا دیا۔

پہلے تو امی کو بہت غصہ آیا۔ دل چاہا کہ اس کی خوب درگت بنائیں، پھر سوچا لوہا گرم ہے۔ اس پر ایسی ضرب لگائی جائے جو حسن کی چوری جیسی قبیح حرکت اور عادت کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دے۔ بیٹا! چوری کی ایک سزا تو تمہیں اس دُنیا میں مل گئی ہے مگر ایک سزا جہنم کی صورت میں اگلے جہاں میں ملے گی۔ حسن سہم گیا اور تقریباً روتے ہوئے بولا۔ ''امی! مجھے معاف کر دیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی چوری نہیں کروں گا۔ اپنے رب کو ناراض نہیں کروں گا۔ امی نے حسن کو پیار کرتے ہوئے اسے گلے سے لگا لیا۔ (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

موتیوں کی کھیتی

(نغمہ فاطمہ، اسلام آباد)

ایک مرتبہ شہنشاہ اکبر اپنے نورتنوں کے ساتھ بیٹھے صلاح مشورہ کر رہے تھے کہ بیربل کو چھینک آ گئی۔ ملا دو پیازہ نے چوٹ کی: ''یہ کیا بدتمیزی ہے، یہ بُرا شگون ہے۔ اب شاید ہم اپنے مقصد میں کام یاب نہ ہو سکیں۔''

شہنشاہ بھی برہم ہوئے۔ انہوں نے اسی وقت بیربل کو محل چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ بھرے دربار میں بیربل کی سبکی ہوئی مگر انہوں نے خاموشی سے برداشت کر لیا اور گھر چلے گئے۔

اس واقعے کو کئی دن گزر گئے۔ بیربل کی غیر موجودگی سے خود بادشاہ بھی پریشان رہنے لگے۔ ان کے بغیر محل سونا سونا لگتا تھا۔

ایک دن شام کو وہ چہل قدمی کرتے ہوئے ملا دو پیازہ کی حویلی کے پاس سے گزر رہے تھے کہ بیربل نظر آئے۔ بادشاہ کو دیکھ کر بیربل جھک کر سڑک کی مٹی کو سونگھنے لگے۔ اس عجیب حرکت پر بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے قریب آ کر پوچھا:

''کیا بات ہے بیربل، تم یہ مٹی کیوں سونگھ رہے ہو؟''

''جہاں پناہ! برسوں کی محنت آج رنگ لائی ہے۔ برسوں سے اس مٹی کو تلاش کر رہا تھا، آخر آج مل ہی گئی۔'' بیربل نے کہا۔

''کیا خوبی ہے اس مٹی میں؟'' بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔

''عالی جاہ! اس مٹی میں موتیوں کی کاشت ہو سکتی ہے۔''

''کیا؟'' بادشاہ کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔

بیربل نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا: ''آزما کر دیکھ لیجیے، مگر ایک خیال آتا ہے کہ بے چارے ملا دو پیازہ کی حویلی کا کیا ہوگا؟''

''کوئی بات نہیں، ہم انہیں نئی حویلی بنا دیں گے۔''

بادشاہ نے بغیر سوچے سمجھے جواب دیا۔

''تم فوراً حویلی گرا کر ہل چلا دو۔''

بیربل کا تیر نشانے پر جا بیٹھا۔ دوسرے دن ملا دو پیازہ کی حویلی گرا دی گئی۔ پھر موتیوں کی فصل کے لیے کھیت تیار کیا گیا۔ بیربل نے شاہی خزانے سے چند قیمتی موتی حاصل کیے تاکہ انہیں کھیت میں بویا جائے مگر انہوں نے موتی کھیت میں بونے کی بجائے اپنے گھر رکھ لیے اور کھیت میں گیہوں کے بیج بو دیے۔ چند مہینوں میں گیہوں کی فصل تیار ہو گئی اور بالیاں لہلہانے لگیں۔

بادشاہ موتیوں کی فصل دیکھنے کے لیے بے چین تھا۔ آخر ایک دن بیربل بادشاہ کو لے کر کھیت پر پہنچے۔ پودوں پر شبنم کے قطرے موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ یہ دیکھ کر بادشاہ کی باچھیں کھل گئیں۔ انہوں نے خوش ہو کر کہا: ''بیربل! واقعی تم نے کمال کر دیا۔''

بیربل نے جواب دیا: ''کمال تو اب ہوگا حضور......''

شہنشاہ موتی توڑنے کے لیے آگے بڑھے تو بیربل نے روک دیا۔ پھر اس نے کہا: ''حضور! ان موتیوں کو صرف وہی شخص چن سکتا ہے جسے زندگی میں کبھی چھینک نہ آئی ہو۔ اگر چھینکنے والا انہیں چھوئے گا تو موتی پانی کے قطروں میں تبدیل ہو جائیں گے۔'' (بقیہ صفحہ نمبر: 43)

کوٹھی کے بیرونی گیٹ سے گھنٹی کی مترنم آواز فضا میں گونجی تھی۔ اس کوٹھی کے مالک کا نام نواز احمد تھا۔ آج اس کی طبیعت ناساز تھی۔ اس نے فون پر اپنے دفتر میں موجود ملازموں کو اپنی رخصت کی اطلاع دے دی تھی۔ ابھی صبح کے دس بجے تھے کہ کوئی ملنے چلا آیا تھا۔ ''دیکھو تو باہر کون ہے؟'' نواز نے اپنے گھریلو ملازم سے کہا۔ وہ گیٹ کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو وہ مسکرا رہا تھا۔ ''کیا ہوا..... کون ہے؟'' نواز نے ملازم کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر پوچھا۔

''ایک جوگی ہے جناب..... کہتا ہے کہ اس گھر میں ایک خطرناک سانپ گھس آیا ہے، اگر اجازت ہو تو پکڑ لوں۔ گھر کے تمام افراد کو خطرہ ہو سکتا ہے۔'' نواز یہ بات سن کر اُچھل پڑا۔

''تم نے اسے کچھ بتایا تو نہیں؟''

''نہیں جناب.....'' ملازم نے انکار میں سر ہلا دیا تھا۔

''اسے اندر لے آؤ۔'' نواز اب سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ملازم کی واپسی ہوئی۔ اس کے ساتھ ایک جوان جوگی موجود تھا۔ جوگی نے سبز رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں لکڑی کے جوتے تھے۔ گلے میں مختلف رنگوں کی مالائیں جھول رہی تھیں۔ ہاتھوں کی تمام انگلیوں میں رنگ برنگے پتھروں کی انگوٹھیاں موجود تھیں۔ اس جوگی کی لمبی زلفیں کندھوں پر جھول رہی تھیں۔ آنکھوں میں سرمہ اور گھنگریالے بالوں کی لمبی داڑھی مونچھ..... اس کے بالوں میں بین دبی ہوئی تھی اور کندھے کے ساتھ ایک جھولا لٹک رہا تھا۔ اس میں جانے کیا کیا موجود تھا۔

''جی جوگی بابا..... کیا پرابلم ہے؟'' نواز نے پوچھا۔

''کیا..... کیا کہا.....؟'' جوگی احمقوں کی مانند نواز کا منہ تکنے لگا۔ اسے لفظ 'پرابلم' کی سمجھ نہیں آئی تھی۔ نواز بھی سمجھ گیا تھا کہ جوگی اَن پڑھ ہے۔ ''مشکل..... کیا مشکل ہے؟'' نواز جلدی سے بولا۔

''مجھے بھلا کیا مشکل ہو گی، مشکل تو اس گھر میں آنے والی ہے۔ اس گھر میں ایک خطرناک سانپ گھس آیا ہے۔'' جوگی کا لہجہ ڈرا دینے والا تھا۔ ''جوگی بابا! آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ اس گھر میں سانپ موجود ہے۔'' تحقیق کرنا نواز کا حق تھا۔

''ہم فقیر لوگ ہیں بچہ..... ہمیں ہمارے علم کے زور پر ہر بات کا علم ہو جاتا ہے۔'' جوگی جوش میں آ گیا تھا۔

''تو پھر ٹھیک ہے، اگر سانپ ہے تو نکال کر دکھاؤ۔'' نواز نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اب جوگی لان میں آ گیا تھا۔ نواز اور ملازم اس کے ہمراہ تھے۔ لان کو سرسبز بیلوں اور مہکتے پھولوں کے ساتھ آراستہ کیا گیا تھا۔ نواز ایک تخیل پسند آدمی تھا۔ وہ قدرتی حسن کو بہت اہمیت دیتا تھا۔ اب جوگی نے اپنی بین کی نے منہ کے ساتھ لگا لی تھی، پھر اس نے بین پر دُھن چھیڑی۔ اس کا سانس پکا تھا، لے

بھی بجتی تھی، سانپ تو کیا انسان بھی جھوم جھوم جائے۔ نواز مسکرا رہا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ سانپ کے کان نہیں ہوتے اور وہ کوئی بھی آواز سننے کے قابل نہیں ہوتا۔ وہ تو بس حرکت کو سمجھتا ہے اور سانپ پکڑنے والے بھی سانپ کی حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر انسان چونک جائے تو سانپ ڈس لیتا ہے اور اگر سانپ چونک جائے تو قیدی بن جاتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے نواز منظر سے ہٹ گیا تھا۔ دو منٹ کے وقفے سے وہ دوبارہ لوٹ آیا۔ بین پر دھن بکھیرتے ابھی جوگی کو پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ سب نے دیکھا، ایک کالے رنگ کا سانپ کیاری سے باہر نکل رہا تھا۔ سانپ دیکھ کر جوگی جوش میں آ گیا۔ ساتھ ہی اس نے نواز کو اشارہ کیا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''کیوں میں نہ کہتا تھا اس گھر میں سانپ گھس آیا ہے جو گھر کے تمام افراد کے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔ احسان مانو کہ میں نے تم سب کو ایک ممکنہ مصیبت سے بچا لیا ہے۔'' اب بین سے اٹھنے والی لے میں تیزی آ گئی تھی۔ جوگی گھٹنوں کے بل بیٹھا بین بجا رہا تھا اور سانپ اس کے سامنے آ کر کنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ جوگی سانپ پکڑ کر اپنے پاس موجود پٹاری میں بند کر لیتا کہ اچانک اس کی بین پر لے کی دھن بگڑ گئی۔ جوگی کی آنکھوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سامنے کیاری میں سے اسے ایک اور سانپ باہر نکلتا نظر آ گیا۔ یہ کوڑیوں والا سانپ تھا۔ جوگی سانپوں کی تمام نسلوں سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نسل کا سانپ بہت زہریلا ہوتا ہے اس کا کاٹا پانی بھی نہیں مانگتا۔ جوگی پر اب گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے تھے۔ جیسے جیسے وہ زہریلا سانپ آگے بڑھ رہا تھا، جوگی ایک ایک قدم پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اب اس کی بین پر دھن اور لے کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ اب تو بس پھونکوں کی آواز آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہٹتے قدم رک چکے تھے۔ پیچھے موجود دیوار نے اس کا راستہ روک لیا تھا۔ وہ زہریلا سانپ اب پھنکارنے لگا تھا۔ اس جوگی کو اپنا استاد یاد آنے لگا تھا۔ ایک لمبے عرصے تک اس نے اپنے استاد کی چاکری کی تھی لیکن اس کے استاد نے اسے زہریلا سانپ پکڑنے کا ہنر نہیں سکھایا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے جب ہوش سنبھالا تو وہ سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر آوارہ پھر رہا تھا۔ پھر اسے بوٹی سائیں نے اپنی پناہ میں لے لیا۔ بوٹی سائیں ایک مداری تھا۔ وہ سڑکوں اور پارکوں میں سانپ اور نیولے کا کھیل دکھایا کرتا تھا۔ یوں اس کی گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔

اس بے سہارا یتیم لڑکے کا نام کیا تھا، وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ ویسے لوگوں نے اسے بہت سے نام دے رکھے تھے۔ اب بوٹی سائیں نے بھی اسے ایک نیا نام 'پروانہ' دیا تھا۔ نام کچھ عجیب سا تھا لیکن اس کی شخصیت کے مطابق تھا۔ وہ کسی پروانے کی مانند ہی بے چین روشنی کی تلاش میں اڑتا پھرتا تھا۔ بوٹی سائیں کے پاس آ کر بھی اسے روشنی نہیں ملی تھی۔ بوٹی سائیں کو تو ایک مفت کا ملازم مل گیا تھا جو گھر اور باہر کے کام بھی کرتا تھا۔ وقت گزرتا رہا اور پروانہ بڑا ہو گیا۔ بوٹی سائیں نے اسے بس دو کام سکھائے تھے۔ ایک بین بجانا اور دوسرا سانپ کا زہر نکال کر اسے بے ضرر بنانا۔ وہ اب بوٹی سائیں کا معاون تھا۔ پھر پروانے کی شادی ہو گئی۔ اللہ نے اسے اولاد کی نعمت سے بھی نواز دیا۔ ایک دن پروانہ گہری سوچ اور غم کے عالم میں بیٹھا ہوا تھا۔ بوٹی سائیں اس کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھا، پھر بھی اس نے پروانے سے پوچھ لیا: ''کیا بات ہے پروانے......؟''

''سائیں میرا ماضی بھی اندھیرے میں ہے اور میرا مستقبل بھی اندھیرے میں ہے۔'' آج پروانے نے بوٹی سائیں سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''میں بس حال میں جی رہا ہوں۔ ایک عرصے سے میں آپ کی خدمت کر رہا ہوں لیکن آپ نے مجھے کسی قابل نہیں بنایا۔ بس میرا سانپ اور بین کے ساتھ تعلق ہے۔ میں آگے جا کر کیا کروں گا؟ اب تو مجھ پر ذمہ داریوں کا بوجھ بھی آ پڑا ہے۔'' بوٹی سائیں اس کی باتیں سن کر ہنسنے لگا، پھر بولا:

''تو میرا بیٹا ہے، میرا داماد ہے۔ میں تمہارے لیے اچھا ہی سوچوں گا۔ سانپ اور بین کا تعلق تمہارے لیے روزی کمانے کا باعث بنے گا لیکن ہر کام کا ایک وقت ہے۔ اب وقت آ گیا ہے، میں نے ساری زندگی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گزار دی لیکن تمہارے لیے میں نے کچھ اور سوچ رکھا ہے۔ تمہیں بھی سانپ کا کھیل ہی دکھانا ہے لیکن سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر نہیں۔'' بوٹی سائیں نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ پروانہ بات سننے کے لیے بے چین تھا، پھر بوٹی سائیں نے اسے دل کی بات بتا دی۔ مسرت کی شدت سے پروانے کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ بقول ان کے دولت کمانے کی اس سے زیادہ شان دار تدبیر اور کوئی ہو نہیں سکتی تھی۔

اگلے دن پروانہ جوگی کا سوانگ بھر کر اپنے سانپ کو ہمراہ لے کر روانہ ہوا۔ کام یابی اسے اپنے قدموں میں نظر آ رہی تھی۔ ابھی دن کا

آغاز ہوا تھا۔ بوٹی سائیں نے اسے تاکید کی تھی کہ کسی بھی گھر میں تب گھسنا ہے جب گھر کا سربراہ گھر میں موجود نہ ہو۔ صبح کے وقت بچے تو اسکول چلے جاتے ہیں اور مرد حضرات اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ گھر میں بس خواتین رہ جاتی ہیں۔ جوگی اب ایک پوش علاقے میں آ گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی تدبیر کی راہ میں پہلا قدم اُٹھایا۔ اس نے اپنا سانپ چپکے سے ایک کوٹھی میں ڈال دیا اور پھر ساتھ ہی کوٹھی کے مین گیٹ پر دستک دے ڈالی تھی۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد ایک نسوانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ ''کون ہے......؟''

''میں جوگی ہوں، بچہ...... میرا علم مجھے بتاتا ہے کہ اس گھر میں ایک زہریلا سانپ موجود ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں سانپ پکڑ لوں، ورنہ گھر کے افراد کو خطرہ ہو سکتا ہے۔'' سانپ کا نام سن کر اس خاتون نے فوراً دروازہ کھول دیا تھا۔ اب جوگی نے بین پر دُھن بجائی۔ فوراً ہی سانپ رینگتا ہوا سامنے آ گیا۔ اس خاتون کی تو خوف کی شدت سے چیخیں نکل گئی تھیں۔ جوگی نے سانپ کو پٹاری میں بند کر لیا تھا۔ اس خاتون نے خوش ہو کر جوگی کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا اور اس کا شکریہ بھی ادا کیا۔ جوگی کی خوشی کا عالم دیدنی تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ خوشی کے عالم میں وہ دیوانہ وار رقص کرنا شروع کر دے۔ بوٹی سائیں کی تدبیر کامیاب ہو چکی تھی اور اب پروانے کو اپنے مستقبل کا کوئی خوف نہیں تھا لیکن آج خوف ایک سانپ کی شکل میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔

لوگوں کو پھنساتے پھنساتے آج نواز کے گھر وہ خود پھنس گیا تھا۔ اب خوف کی شدت سے اس کی بولتی بند ہو چکی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگا سہا کھڑا تھا اور اجنبی زہریلا سانپ اس کے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ جوگی کی طرف سے ایک جنبش کی دیر تھی کہ سانپ اسے ڈس لیتا، ایسے میں جوگی نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ نواز آگے بڑھا تھا۔ اس نے ایک خاص تکنیک سے دونوں سانپوں کو اپنی انگلیوں اور انگوٹھوں کی مدد سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ خوف کے بعد اب حیرت سے جوگی کی آنکھیں پھیل گئی تھیں جب کہ نواز اور اس کا ملازم مسکرا رہے تھے۔

''تم کھیل دکھانے آئے تھے...... ہم نے سوچا کہ ہم بھی ایک چھوٹا سا کھیل تمہیں دکھا دیں۔'' جوگی کے کانوں سے نواز کی آواز ٹکرائی تھی۔

''کک...... کک...... کیا مطلب؟'' وہ اٹکتے ہوئے بولا۔

''اس گھر کے دروازے پر دستک دینے سے پہلے تم نے دروازے پر موجود میرے نام کی تختی نہیں پڑھی، مگر نہیں...... تم تو پڑھنا لکھنا جانتے ہی نہیں ہو۔ میں تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم ایک دھوکے باز آدمی ہو لیکن پھر بھی میں تمہاری مہارت کا مظاہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ افسوس تم فیل ہو گئے۔'' نواز کے لہجے میں ہمدردی کا عنصر موجود تھا۔

''آپ کون ہیں......؟'' اب جوگی نے نواز سے اس کا تعارف پوچھا تھا۔ نواز ہنس پڑا۔

''میں بھی تمہارے جیسا ایک جوگی ہوں، فرق صرف اتنا ہے کہ تم پُرانے جوگی ہو اور میں نئے زمانے کا جوگی ہوں۔ میں ایک ریسرچ سنٹر کا انچارج ہوں جہاں سانپوں اور ان کے زہروں پر تحقیق ہوتی ہے۔ پھر اگلا مرحلہ ادویات کی تیاری کا ہوتا ہے۔ تم میں اور مجھ میں ایک فرق اور بھی ہے، میں کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ جب تم نے اپنا کھیل شروع کیا تھا تو میں نے چپکے سے اپنے پاس موجود ایک سانپ چھوڑ دیا تھا۔ یہ سانپ بھی تمہارے سانپ کی طرح بے ضرر تھا کیوں کہ اس کا زہر نکالا جا چکا تھا لیکن تمہارے اندر کے چور نے تم پر گھبراہٹ طاری کر دی اور یہ بات ظاہر ہو گئی کہ تم دھوکے باز ہو۔'' جوگی کا سر جھک گیا تھا۔ پھر وہ دھیمی آواز میں بولا: ''میرے اُستاد نے میرا نام پروانہ رکھا تھا۔ میں روشنی کی تلاش میں تھا۔ میں ویسے ہی بنا جیسے میرا اُستاد مجھے بنانا چاہتا تھا۔ اس نے جو روشنی مجھے دکھائی میں اس کی طرف پرواز کرنے لگا۔ میں کب جانتا تھا کہ روشنی اندھیرے کو ہی دُور نہیں کرتی بلکہ پروانوں کو جلانے کا سبب بھی بن جاتی ہے۔'' نواز اس جوگی کے درد کو سمجھ گیا تھا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا:

''چاہوں تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں تمہیں روشنی کی طرف لے کر جاؤں گا۔ وہ روشنی جو سلامتی والی ہو گی۔ کل میرے دفتر آ جانا، تمہارے پاس موجود فن کو ہم جائز طریقے سے استعمال کریں گے اور اس کے نتیجے میں تم حلال روزی کمانے کے قابل ہو جاؤ گے۔'' نواز کی پیش کش سے جوگی کے ستے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ جوش کے ساتھ بولا تھا۔

''میں ضرور آؤں گا...... میں ضرور آؤں گا۔'' وہ بیرونی گیٹ کی طرف قدم اُٹھانے لگا تو نواز نے آواز لگائی۔

''سنو! انسانوں جیسے حلیے میں آنا، میں نہیں چاہتا کہ میرے دفتر کا عملہ تمہیں دیکھ کر بھاگ جائے۔''

''جی جناب...... جی جناب......'' سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ روشنی کی طرف سفر تھا۔ ایسی روشنی جو جہالت کے اندھیروں کو دور کر کے راہیں روشن کرتی ہے اور سلامتی کا سبب بنتی ہے۔ ☆

ایک نابینا حافظ صاحب اپنے حجرے کے کونے میں بیٹھے تسبیح پڑھ رہے تھے کہ ان کے پاس دو لڑکے آئے۔ سلام کیا اور بولے: ''حافظ صاحب! ہمارے ساتھ چلیے، ہم نے ختم پڑھوانا ہے۔'' ایک نے کہا۔

''کیسا ختم......؟'' حافظ صاحب نے پوچھا۔

''بزرگوں کے ایصالِ ثواب کے لیے ختم دلوانا ہے، آپ تشریف لے چلیے۔'' دوسرے نے کہا۔

''کیا پکوایا ہے؟'' حافظ صاحب نے پوچھا۔

''جی کھیر اور نان۔'' ایک لڑکے نے جواب دیا۔

''کھیر کیا ہوتی ہے؟'' حافظ صاحب نے پوچھا۔

''جی! دودھ، چاول اور چینی سے ایک لذیذ میٹھی چیز بناتے ہیں، اسے کہتے ہیں کھیر۔'' دوسرے لڑکے نے وضاحت کی۔

''کیسی ہوتی ہے؟'' حافظ صاحب نے پھر سوال کیا۔

''جی! سفید رنگ کی ہوتی ہے۔'' لڑکے نے کہا۔

''سفید رنگ کیسا ہوتا ہے؟'' حافظ صاحب نے مزید وضاحت چاہی۔

''جی سفید، بس یوں سمجھ لیں کہ جیسے بگلا ہوتا ہے؟'' لڑکے نے جواب دیا۔ ''مگر یہ بگلا کیا ہوتا ہے؟'' حافظ صاحب نے پوچھا۔

''جی ایک قسم کا آبی پرندہ ہوتا ہے۔'' لڑکا بولا۔

''کیسا ہوتا ہے وہ آبی پرندہ؟'' حافظ صاحب نے پوچھا۔

لڑکے چڑ گئے۔ ''جی بتایا تو ہے آپ کو سفید رنگ کا ہوتا ہے۔'' دوسرے لڑکے نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔

''ایسی شکل کا ہوتا ہے، آپ ذرا میرا ہاتھ ٹٹول کر دیکھیے......''

لڑکے نے ہاتھ کو ٹیڑھا کر کے بگلے کی شکل میں حافظ صاحب کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے لڑکے کے ہاتھ کو ٹٹول کر محسوس کیا اور پھر اسے پرے دھکیلتے ہوئے بولے۔

''نہ بابا! ایسی ٹیڑھی کھیر مجھ سے نہیں کھائی جائے گی؟''

بچو! جب کوئی بے ڈھنگا یا ناموزوں مرحلہ درپیش ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔

☆☆☆

مدیرِ تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟
معذرت خواہ ہوں کہ اتنے ماہ سے تعلیم و تربیت میں حصہ نہ لے سکی۔ دراصل میرے نویں کلاس کے پیپر ہو رہے تھے جس کی وجہ سے کافی مصروف رہتی۔ فارغ ہوئی تو پتا ہی نہیں چلا کہ دو ماہ کیسے گزر گئے۔ اس ماہ کا تعلیم و تربیت پڑھا تو بہت اچھا لگا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ خسبجا سندباد کا چھٹا سفر...... پُراسرار دریا بہت اچھی لگی۔ ماسی، مالٹے اور ہم بھی بہت مزے کی تھی۔ 26 جون کو میری سال گرہ ہوتی ہے۔ پلیز! آپ مجھے سال گرہ کی مبارک باد دیجیے گا۔
(ثیزہ جاوید، گوجرانوالہ)

☆ کہانیوں کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کو سال گرہ مبارک ہو۔

السلام علیکم! ڈیئر ایڈیٹر صاحب، کیسی ہیں آپ؟ اُمید ہے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم خیریت سے ہوگی۔ اس مہینے کا رسالہ بہت عمدہ تھا۔ سرورق ہمیشہ کی طرح بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔ خاص طور پر درسِ قرآن و حدیث، مکافات، قرض، ماسی، مالٹے اور ہم، کھٹر کھاند گروپ، کڑوا سچ اور انوکھا مزدور بہت عمدہ تھیں۔ ہم سب گھر والے تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اُمید ہے میرا یہ خط ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا۔ میری دُعا ہے کہ تعلیم و تربیت دن دگنی اور رات چگنی ترقی کرے، آمین!
(خرم اقبال، ساہیوال)

☆ آپ کی حوصلہ افزائی اور پسندیدگی کا شکریہ۔

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ، السلام علیکم! میں فجر نادر، ششم جماعت کی طالبہ ہوں۔ میں پچھلے چار سال سے تعلیم و تربیت کا باقاعدگی سے مطالعہ کر رہی ہوں۔ اس رسالے کی وجہ سے مجھے اُردو کے مضمون میں بہت مدد ملتی ہے۔ مزہ بھی آتا ہے اور میری معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ میں اُردو اور انگلش میں نظمیں لکھتی ہوں۔ آپ کو اپنی دو نظمیں بھیج رہی ہوں، اگر پسند آئیں تو پلیز شائع کر دیں۔
(فجر نادر، سیال کوٹ)

☆ جی، ضرور بھیجیں۔

السلام علیکم! ایڈیٹر صاحب، کیسی ہیں آپ؟ میں دو سال سے تعلیم و تربیت کی قاری ہوں مگر آج پہلی مرتبہ خط لکھ رہی ہوں۔ اُمید ہے میرا خط ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا۔ آپ کا شمارہ ہمارے ہاں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ اس کی ہر کہانی سبق آموز ہوتی ہے۔ اس ماہ کا شمارہ زبردست تھا۔ تمام کہانیاں سپرہٹ تھیں۔ مکافات، کڑوا سچ اور انوکھا مزدور زبردست کہانیاں تھیں۔ آپ مسلمان سائنس دانوں کے متعلق بھی کچھ شائع کیجیے۔ میں نہم جماعت کی طالبہ ہوں۔ آپ میری کام یابی کے لیے دُعا کیجیے گا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ مجھے کہانیاں لکھنے کا بہت شوق ہے۔ میں اگلے ماہ کچھ تحریریں بھیج رہی ہوں۔ معیاری ہوں تو ضرور شائع کیجیے گا۔ اُمید ہے خط شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو، اللہ حافظ!
(مسترہ عتیق، مریدکے)

☆ آپ کی کام یابی کے لیے بہت دُعائیں۔

تعلیم و تربیت کے ایڈیٹر اور تمام اسٹاف ممبران کو میری جانب سے السلام علیکم! مئی کے شمارے کا سرورق دل کو موہ لینے والا تھا۔ میں تعلیم و تربیت بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ آج خط لکھنے کی جسارت پہلی بار کر رہا ہوں۔ اُمید ہے آپ میرا خط ضرور شاملِ اشاعت کریں گے۔ تعلیم و تربیت بلاشبہ ایک مکمل رسالہ ہے۔ ہماری تربیت میں اس کا بڑا ہاتھ ہے کیوں کہ یہ دینی، دُنیاوی معلومات کا ذخیرہ ہے اور اس میں تمام کہانیاں سبق آموز ہوتی ہیں۔ ذہنی طور پر یہ ہماری اچھی نشوونما کرتا ہے۔ اس مرتبہ کھٹر کھاند گروپ، کڑوا سچ، محاورہ کہانی، ماسی، مالٹے اور ہم، انوکھا مزدور اور پُراسرار دریا کہانیاں بہت متاثر کن تھیں۔ براہِ مہربانی میرے خط کو ردی کی ٹوکری سے دُور رکھیے گا۔ سب کے لیے دُعائے خیر۔ اللہ حافظ!
(رانا محمد حسین، معین الدین، کوٹ رادھا کشن)

السلام علیکم! ایڈیٹر صاحبہ، کسی ہیں آپ؟ اُمید ہے کہ تعلیم و تربیت

کی پوری ٹیم خیر و عافیت سے ہوگی۔ اس مہینے کا رسالہ بہت اچھا تھا۔ تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ماسی، مالٹے اور ہم کہانی ٹاپ پر تھی۔ میں نے کئی بار خط بھیجا لیکن آپ اسے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے ہیں۔ اگر اس بار شائع نہیں کیا تو پھر میں کبھی خط نہیں لکھوں گی، نہ ہی کسی مقابلے میں حصہ لوں گی اور آپ سے ناراض ہو جاؤں گی۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ تعلیم و تربیت کو مزید ترقی دے۔ آمین! (زینب سحر، بہاول پور)

اس دفعہ رسالہ 3 تاریخ کو ہی مل گیا۔ میں آپ سے ناراض ہوں کیوں کہ آپ میری کوئی تحریر شائع نہیں کرتے۔ میں ہر ماہ کچھ نہ کچھ ارسال کرتی ہوں لیکن شائع نہیں ہوتا۔ مئی کے شمارے میں قرض، کڑوا سچ اور انوکھا مزدور پسند آئیں۔ آپ سے ایک گزارش ہے کہ کوپن کے پیچھے کوئی کہانی شائع نہ کیا کریں۔ شکریہ!

(حرا سعید شاہ، چوک گردت، جوہر آباد)

السلام علیکم! اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ مئی کے شمارے میں نظم ماں کی عظمت، کھڑ کھاند گروپ، کڑوا سچ، سندباد کا چھٹا سفر اور ناول زندہ لاش سب ہی کہانیاں اور نظمیں بہت اعلیٰ تھیں۔ 11 جون کو میرے بابا اور 22 جون کو میری آپی کی سال گرہ ہے۔ آپ ان کو سال گرہ مبارک باد دے دیں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ آمین! ایڈیٹر صاحبہ کے لیے بہت سی دُعائیں میری طرف سے۔ (مقدس چوہدری، راول پنڈی)

☆ آپ کے بابا اور آپی کو سال گرہ مبارک ہو۔

تعلیم و تربیت کا زیرِ نظر مئی کا شمارہ خوب صورت سرورق اور دیدہ زیب مضامین کے ساتھ نظر سے گزرا۔ چاغی پر معلوماتی مضمون اچھا لگا۔ کھوج لگائیے، بلاعنوان، میری بیاض سے، مختصر مختصر، آیئے مسکرایئے سلسلے کام یابی سے چل رہے ہیں۔ اس کی وجہ آپ کی کاوشیں اور ننھے ساتھیوں کی بھرپور شمولیت کا ہونا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ہو۔ کبھی کبھار میری تحریر بھی ایڈیٹر کی ڈاک کی زینت بن جائے تو مزا آ جائے۔ (علینہ احمد، راول پنڈی)

ڈیئر ایڈیٹر انکل! السلام علیکم! اُمید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ آپ سب کو یہ بتانا تھا کہ میری کلاس آٹھویں کا رزلٹ آ چکا ہے اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے میں بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوا ہوں۔ کیا آپ مجھے مبارک باد نہیں دیں گے؟ مئی کا شمارہ سپرہٹ تھا۔ پیارے اللہ کے پیارے نام، کھڑ کھاند گروپ، نخاورہ کہانی، ذائقہ کارنر، سندباد جہازی کا سفر پسند آئے۔ شمارے میں تمام کہانیاں بہت پسند آئیں۔ ننھے اُمید ہے کہ میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں ہو گا۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے، آمین! آپ سے اب اجازت چاہیے۔ تعلیم و تربیت زندہ باد! (عمر رضا)

☆ آپ کو مبارک باد اور کام یابی کے لیے ڈھیروں دُعائیں۔

السلام علیکم! میرا نام مزمل سلیم قادری ہے۔ مجھے آپ کا ماہنامہ تعلیم و تربیت بے حد پسند آیا ہے۔ خاص طور پر مئی 2015ء مجھے پسند آیا۔ کہ جس کا آغاز ماں کی عظمت سے ہوا تھا۔ میں نے آپ کے بارے میں ''سر حسن رضا سردار قادری'' سے سنا تھا جو میرے قابلِ قدر اُستاد ہیں۔ تعلیم و تربیت میں مجھے معراج کا تحفہ اور پُراسرار دریا کہانیاں بہت پسند آئیں جس کو پڑھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ ''میری بیاض سے'' نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے جس کی وجہ سے میں تعلیم و تربیت کا حصہ بننا چاہتا ہوں۔ میں پہلی دفعہ آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ مجھے تعلیم و تربیت میں ضرور شامل کریں گے۔ میری دُعا ہے کہ اس کو شائع کرنے والے ہمیشہ اس طرح شائع کرتے رہیں، آمین! (مزمل سلیم قادری، گوجرانوالہ)

مئی 2015ء کا رسالہ میں نے شروع سے لے کر آخر تک پڑھا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا کیوں کہ اوپر ماں کی تصویر بنی ہوئی تھی اور ماں کی عظمت کو میں کیسے بیان کروں۔ خیر جو بھی ہے، تمام کہانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ میری طرف سے تعلیم و تربیت کی پوری ٹیم کو سلام۔ (مریم نایاب، خوشاب)

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بڑے مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

حافظ مبین فیصل، ڈجکوٹ۔ آیوشہ گوہر، سعدیہ تصور، کبیر والا۔ مشیرہ سلیمان بٹ، گوجرانوالہ۔ فتح محمد شارق، نوشہرہ۔ تماضر ساجد، صادق آباد۔ قانتا ریاض، کائنات ریاض، مردان۔ ولید احمد، اٹک۔ عائشہ خالد، راول پنڈی۔ عماد احمد منیر، لاہور۔ محمد اسد اللہ ناصر، بہاول پور۔ عائشہ اشفاق، پھالیہ۔ زینب کامران قریشی، سرگودھا۔ جویریہ ادریس، سیال کوٹ۔ سنبل طٰہٰ، عروج ماہین، پنڈ دادن خان۔ محمد عثمان علی، بھکر۔ نوشین سلیم، بورے والا۔ سحر الٰہی، لاہور۔ محمد سلیم مغل، قصور۔ محمد سہیل شریف، ہرنولی۔ اسامہ ظفر راجا، سرائے عالم گیر۔ محمد حسن سعید نظامی، لاہور۔

لندن میں منعقدہ تینوں گول میز کانفرنسوں (1930ء، 1931ء اور 1932ء) تک ناکامی کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے ہمیشہ کے لیے لندن میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بعد میں مسلم رہنماؤں کے قائل کرنے پر دوبارہ ہندوستان آئے اور مسلم لیگ میں نئی جان ڈال دی۔

صوبہ سندھ وہ پہلا صوبہ تھا جس نے 1938ء میں صوبائی اسمبلی میں ایک علیحدہ ملک کی قرارداد منظور کی۔ اس قرارداد کے منظور ہونے کے دو سال بعد لاہور میں وہ تاریخی جلسہ ہوا، جس نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک منزل کی سمت موڑا۔ اس موقع پر مسلمانوں نے ایک علیحدہ ملک کو ہی اپنے لیے اہم سمجھ کر تن من دھن کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کیا۔

اسی دوران دوسری جنگ عظیم کے بادل بھی کئی ملکوں کے سروں پر منڈلاتے رہے، مگر ہندوستان کے مسلمان نئے آزاد ملک کے حصول کے لیے ہر دم سرگرم رہے۔ 1946ء کے آخر میں بالآخر آزادی کی منزل قریب ہوتی نظر آئی۔ عبوری حکومت میں مسلم لیگ نے شمولیت اختیار کی۔ فروری 1947ء میں وزیر خزانہ لیاقت علی خان نے متحدہ ہندوستان کا آخری بجٹ پیش کیا جو انقلابی ثابت ہوا۔ اس میں صنعت کاروں پر بھاری ٹیکس لگایا گیا اور عام استعمال کے نمک سے ٹیکس ختم کر دیا گیا۔ قائد ملت کا یہ بجٹ ہندو صنعت کاروں پر بجلی بن کر گرا۔ چند دنوں بعد ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ویول کی رخصتی اور نئے وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی آمد ہوئی۔ ہندوستان کو دو علیحدہ مملکتوں میں تقسیم کر کے آزادی دینے کا مرحلہ اب قریب سے قریب تر آ رہا تھا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو جواہر لال نہرو نے نئے آزاد ہونے والے ملک "انڈیا" کا گورنر جنرل نامزد کر دیا تھا۔ اس سے وائسرائے کے دل میں یہ خواہش جاگی کہ اگر مسلم لیگ بھی مجھے پاکستان کا گورنر جنرل بنا دے تو میں آزاد ہونے والے دونوں ملکوں کا نظم و نسق بہتر انداز میں چلا سکوں گا مگر مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے سامنے ان کی نہ چل سکی۔

ان ہی دنوں وہ تاریخ ساز لمحہ آن پہنچا جب تاجِ برطانیہ کے زیر سایہ چلنے والے ملک ہندوستان کی تقسیم کا اعلان ہونا تھا۔ یہ تاریخ 3 جون 1947ء کی تھی، جب آل انڈیا ریڈیو دہلی پر شام سات بجے جواہر لال نہرو، سردار بلدیو سنگھ اور قائداعظم محمد علی جناح تقسیم ہند سے متعلق تقریر کرنے تشریف لائے۔ وہ دن ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لیے انتہائی جوش و خروش کا دن تھا۔ ہر مسلمان کا چہرہ خوشی سے معمور تھا...... اور کیوں نہ ہوتا، طویل جدوجہد کا صلہ آج ملنے والا تھا۔ تحریکِ پاکستان نے بالآخر کام کر دکھایا اور

برطانوی حکومت کو ہندوستان کی آزادی کا فیصلہ کرنا پڑا۔

شام کے ٹھیک سات بجے وائسرائے ہاؤس سے ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقریر ریڈیو پر نشر ہونے لگی۔ وائسرائے نے کہا: ''پورا منصوبہ بے عیب نہ سہی لیکن تمام منصوبوں کی طرح اس کی کامیابی اس جذبہ خیر سگالی پر منحصر ہے جس سے اس پر عملدرآمد ہوگا۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا ہے کہ انتقالِ اقتدار جلد سے جلد ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے جو تجویز پیش کی تھی، وہ منظور کر لی گئی ہے۔''

اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے تقریر کی، جس کا ہندوستانی ترجمہ بھی انہوں نے خود ہی پڑھا۔ پنڈت نہرو کے بعد قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی تقریر شروع کی۔ قائداعظم نے فرمایا: ''جو وزنی اور مشکل کام ہمیں سرانجام دینا ہے، دُنیا میں اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ اب ہندوستانی رہ نماؤں پر بڑی بھاری ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی تمام تر قوت اس پر صرف کر دیں کہ انتقال اختیار پُرامن طریقے سے اور ترتیب کے ساتھ عمل میں آئے۔ میں نہایت خلوص کے ساتھ ہر ذمہ دار اور بالخصوص مسلمانانِ ہند سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ امن اور انتظام قائم رکھیں۔''

اس کا اُردو ترجمے کا اعزاز سید انصار ناصری کو حاصل ہوا۔ انہوں نے ترجمے کا آغاز ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' سے کیا۔ اس کے بعد عام اُردو زبان میں اس کا ترجمہ نشر کیا۔ حالاں کہ انہیں سرکاری طور پر وہ ترجمہ دیا گیا تھا جس میں ہندی الفاظوں کی بھرمار تھی۔ اگر وہ ہندی الفاظوں والا ترجمہ پڑھ دیتے تو یقیناً ہندوستان بھر کے مسلمانوں کو سخت مایوسی ہوتی، کیوں کہ اس کا سمجھنا مسلمانوں کے لیے انتہائی مشکل تھا۔ یہ ترجمہ دراصل ہندو ذہنیت کی ایک سازش تھی جسے سید انصار ناصری نے ناکام بنا دیا۔ تقریر کے اختتام پر انہوں نے پوری قوت سے ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ لگایا تھا۔ یہ نعرہ قائداعظم محمد علی جناح نے بھی اپنی انگریزی تقریر کے آخر میں لگایا تھا۔

اس کے بعد سردار بلدیو سنگھ نے سکھوں کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی تقریر کی۔ وہ عبوری حکومت میں وزیرِ دفاع بھی تھے۔

قائداعظم کی تقریر کے موقع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی پر مسلمانوں کا جوش قابلِ دید تھا۔ قائداعظم کی آمد کے ساتھ مسلمان اسٹاف نے جس والہانہ انداز میں ان کا استقبال کیا، اس نے قائداعظم کو بے حد متاثر کیا۔ ریٹائرڈ رسالدار میر افضل خان نے انہیں سلیوٹ کیا اور آخر وقت تک ان کے ساتھ ساتھ رہا۔

جب رات 11 بجے نشریات ختم کر کے سید انصار ناصری گھر جانے نکلے تو اس موقع کے تاثرات وہ لکھتے ہیں:

''میں، شکیل احمد، تابش، اخلاق احمد، عباسی اور خان براڈ کاسٹنگ ہاؤس سے نکلے تو کس طرح اس ہجوم نے ہمارا استقبال کیا اور کناٹ پیلس تک جلوس نکالا، وہ جوش و خروش عمر بھر یاد رہے گا۔ جیسے ہم ہی نے پاکستان بنایا تھا اور ہم ہی قائداعظم کی نمائندگی کر رہے تھے۔''

سید انصار ناصری بعد میں ریڈیو پاکستان کا حصہ بنے اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ انہوں نے 3 جون 1947ء سے 14 اگست 1947ء کے واقعات کی لمحہ بہ لمحہ روداد اپنی کتاب ''پاکستان زندہ باد'' میں تفصیلاً تحریر کی ہے۔ آپ جب کالج اور یونیورسٹی تک پہنچیں تو اس کتاب کو ضرور پڑھیں۔ یہ ہماری تحریک پاکستان کے آخری دِنوں کی دلچسپ کہانی ہے۔ سید انصار ناصری نے 19 مئی 1997ء کو راولپنڈی میں وفات پائی۔

3 جون 1947ء کو اعلانِ آزادی کے بعد اب ہر قدم تقسیم ہند کی جانب اُٹھ رہا تھا۔ پھر وہ مبارک ساعت آ پہنچی جب 14 اور 15 اگست 1947ء کی درمیانی شب رات 12 بجے لاہور ریڈیو اسٹیشن، پشاور ریڈیو اسٹیشن اور ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن سے قیام پاکستان کا اعلان ہوا۔

لاہور ریڈیو سے ظہور آذر کی آواز میں پہلے انگریزی اور پھر اُردو میں مصطفیٰ علی ہمدانی کی آواز میں ''پاکستان براڈ کاسٹنگ'' کے اعلان کے ساتھ ہی قیامِ پاکستان عمل میں آ گیا اور مسلمانانِ ہند کو ان کی منزل مل گئی۔

اگلے روز 15 اگست 1947ء کو قائداعظم محمد علی جناح نے پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ ان سے یہ حلف جسٹس عبدالرشید نے لیا۔ اس کے بعد قائداعظم نے لیاقت علی خان سے وزیراعظم کے عہدے کا حلف لیا، بعد میں چھ رکنی کابینہ نے بھی اپنے اپنے عہدے کا حلف اُٹھایا۔ اس میں سردار عبدالرب نشتر، راجہ غضنفر علی خان، فضل الرحمٰن، اسماعیل ابراہیم چندریگر، ملک غلام محمد اور جوگندر ناتھ منڈل شامل ہیں۔

☆☆☆

آج مس شمائلہ کی کلاس کے طالب علم بہت خوش تھے۔ وہ خوشی سے گنگنا رہے تھے کیوں کہ اگلے دن مس شمائلہ اپنی کلاس کے طالب علموں کو سمندر کی سیر کے لیے لے کر جا رہی تھیں۔ انہوں نے سب بچوں کو تلقین کرتے ہوئے کہا۔ ''خیال رہے کل کوئی بچہ دیر سے نہ آئے۔ کل صبح دس بجے اسکول کی بس اسکول کے دروازے پر تمہیں لینے کے لیے تیار کھڑی ہوگی اور بچوں کا صرف دس منٹ انتظار کرے گی۔ آپ سب کو وقت کا پابند ہونا چاہیے۔'' وہ اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے بولیں۔ ''ہم تو بس کے آنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جائیں گے۔'' راغب نے خوشی خوشی کہا۔ ارتکاز کہنے لگا: ''میں تو دس منٹ پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔'' معاذ تھوڑا سا فکرمند تھا۔ وہ کہنے لگا کہ اس نے اپنی امی کے لیے خریداری کرنے کل صبح بازار جانا ہے لیکن امید ہے کہ وہ مقررہ وقت سے پہلے تمام کام نمٹا لے گا۔ پھر وہ سبھی خوشی خوشی اسکول سے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔

سب کے ذہنوں میں کل کی تفریح کے بارے میں تجسس بھرا تھا۔ وہ سمندر میں نہانے کا سوچ رہے تھے اور ریت کے قلعے بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ کلاس کے سبھی بچے صبح سویرے ہی جاگ گئے۔ وہ ہفتے کا دن تھا۔ زیادہ بچوں کے لیے گھر میں کرنے کے لیے کوئی اتنے کام نہیں تھے۔ کئی بچوں نے اپنا بستر خود سمیٹا۔ کئی بچوں نے اپنے کھلونے صاف کیے۔ کئی نے بازار سے گھر کے لیے کوئی سودا سلف لانا تھا۔ بعض بچوں کو پالتو جانوروں کی خوراک کا بندوبست کرنا تھا مگر معاذ خود سے کہہ رہا تھا کہ اسے امی کی چیزیں لانے بازار جانا ہے۔ وہ خود سے باتیں بھی کر رہا تھا اور پڑوس میں جھانک بھی رہا تھا جو راغب کا گھر تھا اور راغب اپنے گھر کے باغیچے میں بیٹھا مزے سے کہانیوں کی کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس نے راغب کو اونچی آواز میں پکار کر کہا: ''راغب! میرا انتظار کرنا۔ میں جتنی جلدی ہو سکا واپس آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر تھوڑی دیر بھی ہو گئی تو ہم اکٹھے بھاگ کر اسکول پہنچ جائیں گے۔'' راغب نے وعدہ کرتے ہوئے معاذ کو کہا کہ وہ ضرور معاذ کا انتظار کرے گا۔ راغب نے اسے دوبارہ تنبیہہ کی کہ وہ دیر نہ کرے اور وقت پر واپس آ جائے۔

یہ باتیں کر کے معاذ بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے خاصی زیادہ خریداری کرنی تھی اور دُکانیں چیزوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اسے کریانہ کی دُکان پر بہت دیر انتظار کرنا پڑا لیکن آخرکار اسے اپنی مطلوبہ چیزیں مل گئیں۔ پھر اسے بیکری جانا تھا اور آخر میں دوائیوں کی دُکان پر۔ یہ کام ختم کر کے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی تو ساڑھے نو بج گئے تھے۔ اب اسے جلد از جلد گھر پہنچنا تھا کیوں کہ گھر پہنچ کر ابھی اس نے اپنا لباس بھی تبدیل کرنا تھا۔ اس کے پاس بہت تھوڑا وقت تھا لیکن جتنی اسے جلدی تھی، اتنا اس کے کام

میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کی قمیص کی آستین کا بٹن ٹوٹا ہوا ہے لیکن اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس ابھی بھی اتنا وقت ہے کہ اپنا بٹن لگا سکے۔ وہ ابھی ای سے بٹن لگوا ہی رہا تھا کہ اسے راغب کے آنے کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہ اس کے گھر میں تھا اور سیڑھیوں سے نیچے بلا رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''اب آ بھی جاؤ معاذ! صرف پانچ منٹ رہ گئے ہیں، دس بجنے میں۔ اب میں تمہارا اس سے زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔'' معاذ چلّایا: ''آ رہا ہوں...... آ رہا ہوں۔'' پھر اس نے جلدی سے قمیص پہنی، اپنا بیگ اُٹھایا اور سیڑھیوں سے نیچے بھاگا۔ اس نے ماں کو خدا حافظ کہا اور راغب کے ساتھ تقریباً دوڑنے لگا۔ راغب اسے کہہ رہا تھا کہ بس اسکول کے باہر آ گئی ہو گی اور اگر ہم لیٹ نہ بھی ہوئے تو پھر بھی ہمیں اچھی جگہ پر سیٹیں نہیں ملیں گی۔

وہ دوڑتے ہوئے اگلی گلی میں پہنچے۔ جیسے ہی وہ گلی کے کونے پر پہنچے، ایک سائیکل جس پر ایک لڑکا سوار تھا، ایک سمت سے آیا۔ اسی وقت دوسری سمت سے ایک کتا سڑک عبور کر رہا تھا اور سائیکل سوار اسے بچاتے بچاتے اس سے ٹکرا گیا۔ کتا تکلیف سے چلّانے لگا۔ لڑکا سائیکل سے گر کر سڑک سے ٹکرایا اور سائیکل اس کے اوپر گر گئی۔ وہ زمین پر سیدھا سیدھا لیٹ گیا جیسے اس حادثے سے اپنے حواس کھو بیٹھا ہو۔ دونوں دوست بھی مجبوراً وہاں رُک گئے۔ معاذ دوڑ کر گرے ہوئے لڑکے کے پاس گیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور پھر بیٹھ کر اپنا گھٹنا دبانے لگا جو زخمی ہو گیا تھا اور اس میں سے خون نکل رہا تھا۔ وہ بولا: ''کیا مضحکہ خیز صورت حال ہے۔ میرا گھٹنا زخمی ہے اور میری سائیکل کا حال دیکھو، میں اس پر بیٹھ کر گھر بھی نہیں جا سکتا۔ اس کا اگلا پہیہ خراب ہو چکا ہے۔ میرے بیگ سے تمام چیزیں نکل کر باہر بکھر گئی ہیں۔ کیا تم انہیں اکٹھا کر دو گے؟'' وہ معاذ کا ہم عمر ہی تھا لیکن وہ ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے۔ معاذ اس کی چیزیں اکٹھی کرنے لگا لیکن راغب رُک نہیں رہا تھا۔ اس نے معاذ کو کہا کہ وہ اب ایک منٹ بھی نہیں رُک سکتے کسی اور کو اس کی مدد کرنے دو۔ ہمیں بس پکڑنی ہے مگر معاذ نے راغب کی منت کی: ''راغب! تم میری مدد کرو گے تو ہم بآسانی بس پکڑ لیں گے۔ تم چیزیں اکٹھی کر کے مجھے دو اور میں لڑکے کی مدد کرتا ہوں۔'' راغب چلّا کر بولا: ''اور اس طرح میں اس بس پر سوار ہونے سے رہ جاؤں جس نے مجھے سمندر کے کنارے لے کر جانا ہے۔ دس بج کر پانچ منٹ ہو چکے ہیں، میں جا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ آ رہے ہو یا نہیں؟'' معاذ نے دوبارہ راغب کی منت کرتے ہوئے کہا کہ ایک منٹ انتظار کرو میں اتنی دیر تک اس لڑکے کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا جب تک کہ یہ اس قابل نہ ہو جائے کہ اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہو سکے اور سائیکل کی سواری کر سکے۔ یہاں اور کوئی نہیں ہے جو اس کی مدد کر سکے بلکہ راغب تم جاؤ اور مس شمائلہ کو ساری بات بتاؤ اور انہیں درخواست کرو کہ وہ کچھ لمحے رُک کر میرا انتظار کر لیں۔ راغب یہ سن کر بہت ناراض ہوا اور وہاں سے چل دیا۔ وہ اپنے دوست معاذ کی بے وقوفی پر ناراض ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکے کو اپنی مدد آپ کرنی چاہیے تھی۔ وہ کوئی شدید زخمی نہیں تھا۔ وہ بآسانی اپنی چیزیں اُٹھا سکتا تھا۔ اب اگر معاذ سے بس چھوٹتی ہے تو چھوٹ جائے، اس کی بلا سے۔

وہ دوڑتے ہوئے اسکول کے گیٹ پر پہنچا تو بس ابھی وہاں کھڑی تھی۔ تمام بچے بس میں سوار ہو چکے تھے۔ مس شمائلہ بس کے باہر کھڑی راغب اور معاذ کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے راغب سے پوچھا کہ معاذ کدھر ہے تو راغب نے بتایا کہ وہ راستے میں آتے ہوئے ایک فضول کام میں اُلجھ گیا ہے اور میں نے اسے کہا بھی کہ بس چھوٹ جائے گی مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔ مس شمائلہ نے گھڑی پر وقت دیکھا اور منہ میں بڑبڑائیں: ''شرارتی معاذ! ہم ایک منٹ اس کا اور انتظار کریں گے اور بس!!'' اُدھر معاذ نے لڑکے کو کھڑا ہونے میں مدد کی۔ وہ اب بہتر نظر آ رہا تھا۔ تمام چیزیں سلیقے سے معاذ نے اس کے بیگ میں رکھ دی تھیں۔ اس کی سائیکل چلنے کے قابل نہیں تھی، اسے اب پیدل گھر جانا تھا۔ معاذ نے اسے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ کچھ دیر سامنے والی دیوار پر بیٹھ کر اپنے اوسان درست کرے اور پھر گھر کو روانہ ہو۔ پھر اس نے تاسف کا اظہار کرتے ہوئے لڑکے کو بتایا کہ وہ اب مزید نہیں رُک سکتا کیوں کہ باقی بچے اس کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ وہ وہاں سے بے اختیار دوڑ پڑا اور لڑکا اسے جاتے دیکھ کر سوچتا ہی رہ گیا کہ وہ کتنا رحم دل لڑکا ہے۔ یہ خوش قسمتی کی بات ہوتی ہے کہ کوئی آپ پر مصیبت کے وقت مہربانی کرے۔

معاذ اسکول کے گیٹ پر پہنچا اور بے چینی سے اِدھر اُدھر بس کو ڈھونڈنے لگا لیکن بس اس کے بغیر ہی جا چکی تھی۔ بس صرف اس لیے چھوٹ گئی تھی کیوں کہ اس نے زخمی لڑکے کی مدد کرتے ہوئے کچھ دیر کر دی تھی۔ راغب صرف اپنی خودغرضی کی وجہ سے بس تک پہنچ سکا تھا۔ معاذ سوچ رہا تھا کہ کس طرح وہ اس لڑکے کی مدد کیے

بغیر آ سکتا تھا۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہے اور اس کے رخساروں پر آ گئے۔ وہ صبح سے کاموں میں جتنی جلدی دکھا سکتا تھا، اس نے دکھائی تھی۔ اس نے بھاگ بھاگ کر امی کے لیے چیزیں خریدیں، پھر بھی بس چھوٹ گئی تھی۔ وہ واپس گھر جانے کے لیے مڑا۔ وہ بھول گیا تھا کہ زخمی لڑکا ابھی اس کے راستے میں دیوار پر بیٹھا تھا۔ وہ آنسوؤں سے بھری آنکھیں ہونے کی وجہ سے اسے نہ دیکھ سکا۔ وہ بہت ہی مایوس تھا۔ لڑکے نے اسے واپس آتے دیکھا تو حیران ہو گیا۔ اس نے معاذ کو بلایا: ''بھائی کیا ہوا ہے؟ ادھر آ کر مجھے بتاؤ۔'' معاذ نے اسے ساری بات بتائی لیکن اب لڑکے کی باری تھی کہ وہ معاذ کو تسلی دے۔ اس نے کہا: ''کتنی شرم کی بات ہے میری وجہ سے تمہاری بس چھوٹ گئی۔'' معاذ نے اسے اپنا نام بتایا اور کہنے لگا کہ اب وہ اس کے ساتھ اس کے گھر جا سکتا ہے تاکہ اس کا سائیکل گھر پہنچائے کیوں کہ وہ ابھی بھی زخمی ہے اور اس کے گھٹنے سے خون نکل رہا ہے۔

معاذ لڑکے کو جس کا نام شوال تھا، اس کے گھر لے گیا۔ وہ تین گلیاں پرے ایک انتہائی خوب صورت گھر میں رہتا تھا۔ اس کے ابا گھر کے باغیچے میں بیٹھے تھے۔ وہ شوال کے پاس جلدی سے آ گئے اور اس سے پوچھنے لگے: ''شوال یہ کیا ہوا ہے، تمہیں یہ چوٹ کیسے لگی؟'' معاذ نے شوال کے ابا کو سارا معاملہ بتایا۔ پھر شوال نے ابا کو معاذ کی مہربانی کا بتایا تو انہوں نے معاذ کو گھر کے اندر آ کر کچھ کھانے پینے کو کہا اور فرسٹ ایڈ بکس لینے چلے گئے تاکہ شوال کے گھٹنے پر پٹی کی جا سکے۔ جب وہ شوال کی پٹی کر رہے تھے تو شوال نے انہیں معاذ کے بارے میں بتایا کہ کس طرح اس کی بس چھوٹ گئی ہے اور وہ تفریح کے لیے سمندر پر صرف اس کی وجہ سے نہیں جا سکا تو شوال کے ابا نے کہا کہ وہ معاذ کو سمندر پر لے جاتے ہیں۔ تمہارے لیے بھی چوٹ کے بعد سمندر کی فضا اچھی رہے گی اور سمندر کے بعد تم دونوں کو اپنے دوست عدنان صاحب کے ہاں لے چلوں گا، جہاں تم بہت لطف اندوز ہو گے۔ شوال اور معاذ دونوں یہ سن کر بہت خوش ہوئے۔

معاذ کو تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آج بڑا ہی بُرا دن ہے مگر اب لمحوں میں اس کی سمندر کی خواہش پوری ہونے والی تھی۔ اس نے شوال کے ابا کا شکریہ ادا کیا۔ جلد ہی وہ شوال کے گھر سے شوال کے ابا کی بڑی سی کار میں روانہ ہوئے۔ پہلے وہ معاذ کے گھر آئے اور معاذ کی امی سے معاذ کے لیے اجازت لی۔

وہ بھی معاذ کی کہانی سن کر خوش ہوئیں۔ شوال کے ابا نے گاڑی چلائی۔ معاذ کو بہت مزہ آیا۔ وہ اتنا تیز جا رہے تھے کہ معاذ نے شوال کے ابا سے پوچھا کہ کیا وہ اسکول کی بس سے بھی پہلے ساحل سمندر پر پہنچ جائیں گے۔ شوال کے ابا کو اُمید تھی کہ اگر وہ پہلے نہ بھی پہنچے تو پھر بھی تقریباً ایک ہی وقت میں پہنچیں گے۔ وہی ہوا، وہ ساحل سمندر پر پہنچے ہی تھے اور دونوں لڑکے سمندر کی بے کراں وسعتوں کو دیکھ رہے تھے کہ بس بھی پہنچ گئی۔ یہ اسکول کی بس ہی تھی۔ راغب، معاذ کی طرف اشارے کر کے دوسرے بچوں کو دکھا کر کہنے لگا۔ ''وہ دیکھو! وہ معاذ ہے۔ ہم تو تمہیں پیچھے چھوڑ آئے تھے تم ہم سے پہلے کیسے پہنچ گئے؟'' وہ گاڑی سے اُترا اور معاذ کی طرف دوڑا لیکن پاس کھڑے شوال نے راغب کے لیے کوئی گرم جوشی نہیں دکھائی۔ اس نے ابا کو بتایا کہ یہی وہ لڑکا ہے جس نے میرا خیال نہیں کیا تھا اور میری مدد کرنے کی بجائے صرف معاذ کو کہتا رہا کہ چھوڑو ہماری بس چھوٹ جائے گی۔ پھر معاذ کو چھوڑ کر بھاگ گیا اور بس والوں کو بھی معاذ کا انتظار کرنے کو نہیں کہا۔ یہ سن کر شرم سے راغب کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس نے خودغرضی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ واپس چلا گیا۔ وہ بہت شرمندہ تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ کاش اس نے ایسا نہ کیا ہوتا۔

اب معاذ کے مزے تھے، وہ اپنی اچھی نیت کی وجہ سے گاڑی میں گھوم رہا تھا اور ابھی اس نے سارا دن اچھا گزارنا تھا۔ واقعی معاذ کے لیے وہ شان دار دن تھا۔ شوال کے ابا کے دوست عدنان صاحب نے بچوں کو آئس کریم کھلائی اور ساحل سمندر پر پکنک منائی۔ چائے کے بعد آئس کریم کا ایک دور بچوں نے چلایا۔ انہوں نے گھڑ سواری کا بھی مزہ لیا۔ شوال کے ابا کو معاذ بہت پسند آیا تھا۔ شوال کے ابا نے کہا: ''ہم انشاء اللہ کئی دفعہ اس طرح کی پکنک منائیں گے اور معاذ ہر ہفتے تم ہمارے گھر چائے پینے آؤ گے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم اور شوال اچھے دوست ثابت ہو گے۔ ایسا دوست جو دوست کی مصیبت میں کام آئے۔ پھر دونوں واقعی پکے دوست بن گئے۔ کھیل کود میں انہیں اکٹھے ہونا بہت اچھا لگتا۔ میرا خیال ہے، بچو! آپ کے لیے اس کہانی میں یہی سبق پنہاں ہے کہ اچھے سلوک سے دوست ملتے ہیں اور دوست وہی ہے جو مشکل وقت میں کام آئے۔ ☆☆☆

بہت کم لوگ ان عظیم کرکٹرز کے بارے میں جانتے ہیں جنہوں نے اپنے ملک کی طرف سے پہلی سنچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ ایسا اس لیے بھی ہے کہ یہ کرکٹ کے ابتدائی دنوں کی باتیں ہیں۔ جیسے ٹیسٹ کرکٹ 15 مارچ 1877ء کو شروع ہوئی اور پھر پاکستان میں ٹیسٹ کرکٹ کا آغاز 1952ء میں ہوا تو اس لیے یہ ریکارڈز لوگوں کے ذہنوں سے محو ہیں۔ تاہم دوسری طرف ان عظیم بلے بازوں کا یہ ریکارڈ اس لحاظ سے بھی انفرادیت کا حامل ہے کہ اسے ان سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ جب بھی کرکٹ کی تاریخ لکھی جائے گی۔ ان عظیم بلے بازوں کا تذکرہ ضرور ہوگا۔

اس مضمون میں ہم انہی بلے بازوں کا ذکر کر رہے ہیں، جنہوں نے اپنے اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہوئے پہلی ٹیسٹ سنچری اسکور کی۔

آسٹریلیا...... چارلس بینرمین:

ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کے پہلے ہی میچ میں آسٹریلوی بلے باز چارلس بینرمین نے سنچری بنا کر یہ منفرد اعزاز حاصل کیا۔ انہوں نے ہی ٹیسٹ کرکٹ کی تاریخ کی پہلی گیند کھیلی اور پہلا رن بنایا۔ 1876-77ء میں انگلینڈ کے خلاف کھیلے گئے پہلے ٹیسٹ میچ کی پہلی اننگز میں ہی 165 رنز کی خوب صورت اننگز تراشی جب کہ ان کی پوری ٹیم 245 رنز بنا پائی۔ یوں ان کے رنز کل اسکور کا 67.3 فیصد تھے جو کہ ایک الگ ریکارڈ ہے۔

انگلینڈ...... ڈبلیو جی گریس:

آسٹریلیا کی طرف سے پہلی ٹیسٹ سنچری کے بعد انگلش بلے بازوں میں بھی یہ خواہش انگڑائی لینے لگی کہ وہ بھی اپنے ملک کی طرف سے پہلی سنچری بنائیں۔ تاہم ان کی یہ حسرت ٹیسٹ کرکٹ کے چوتھے میچ میں پوری ہوئی۔ جب انگلینڈ کے عظیم بلے باز ڈبلیو جی گریس نے 1880ء میں اوول کے میدان میں آسٹریلیا کے خلاف 152 رنز کی اننگز کھیلی جب کہ ٹیم کا مجموعہ 420 تھا۔ اس میچ میں ڈبلیو جی گریس کے دو اور بھائی بھی کھیل رہے تھے مگر وہ صفر پر آؤٹ ہوئے۔

جنوبی افریقہ...... جمی سنکلیر:

جنوبی افریقہ تیسرا ملک تھا جس کے بلے باز نے اپنے ملک کی طرف سے پہلی ٹیسٹ سنچری اسکور کی اور وہ تھے جمی سنکلیر۔ 1898-99ء میں جمی سنکلیر نے انگلینڈ کے خلاف 106 رنز کی شاندار اننگز کھیلی۔ تاہم ان کی ٹیم یہ میچ نہ جیت سکی۔ اس کے بعد انہوں نے مزید دو سنچریاں بنائیں۔ یوں اپنے ملک کی طرف سے پہلی 3 سنچریاں انہی کے کھاتے میں گئیں۔

ویسٹ انڈیز......کلفورڈ وچ:

کلفورڈ وچ، ویسٹ انڈیز کے ایک جارحانہ مزاج بلے باز تھے۔ جنوری 1930ء میں انہوں نے انگلینڈ کے خلاف برج ٹاؤن ٹیسٹ میں 122 رنز بنا کر پہلی ٹیسٹ سنچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ کلفورڈ کے پاس یہ منفرد اعزاز بھی ہے کہ انہوں نے اپنے ملک کی طرف سے پہلی سنچری کے ساتھ پہلی ڈبل سنچری بھی اسکور کی۔

نیوزی لینڈ......سٹیوی ڈیمپز:

نیوزی لینڈ کے سٹیوی ڈیمپز پہلے باز تھے جنہوں نے اپنے وطن کے لیے سنچری بنائی۔ انہوں نے 1930ء میں انگلینڈ کے خلاف ولنگٹن کے مقام پر 136 رنز کی بہترین اننگز کھیلی۔ ڈیمپز کا شمار نیوزی لینڈ کے بہترین بلے بازوں میں ہوتا تھا۔

بھارت...... لالہ امرناتھ:

لالہ امرناتھ کا شمار بھارت کے بہترین آل راؤنڈرز میں ہوتا تھا۔ دسمبر 1933ء میں انہوں نے انگلینڈ کے خلاف 118 رنز کی شاندار اننگز کھیلی۔ یہ بھارت کی طرف سے ٹیسٹ میچز میں پہلی سنچری تھی۔ اس غیر معمولی اعزاز پہ میچ کے بعد ہزاروں مداحوں نے انہیں بھرپور خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ان کے ہوٹل کا رخ کیا اور انہیں گلدستے اور قیمتی تحائف سے نوازا۔

پاکستان...... نذر محمد:

نذر محمد نے نہ صرف پاکستان کی طرف سے پہلی ٹیسٹ سنچری بنائی بلکہ پہلی گیند کا سامنا بھی انہوں نے ہی کیا۔ نومبر 1952ء میں بھارت کے خلاف سیریز کے پہلے ٹیسٹ میں شکست کے بعد دوسرے ٹیسٹ میچ میں انہوں نے 515 منٹ تک کریز پر کھڑے ہو کر 124 ناٹ آؤٹ رنز بنائے اور پہلے ٹیسٹ میں شکست کا بدلہ لے لیا۔ انہوں نے اس اننگز کے دوران نہ صرف پہلی سنچری کا منفرد ریکارڈ بنایا بلکہ بیٹ کیری کرنے والے پہلے بلے باز ہونے کا اعزاز بھی حاصل کیا۔

سری لنکا...... سدھاتھ وٹمنی:

مارچ 1982ء میں فیصل آباد میں پاکستان کے خلاف سری لنکا کی تاریخ کے تیسرے ٹیسٹ میچ میں ایک سری لنکن بلے باز سدھاتھ وٹمنی نے پہلی ٹیسٹ سنچری بنانے کا اعزاز حاصل کیا۔ انہوں نے 372 منٹ تک کریز پر رہنے کے بعد 157 رنز کی بہترین اننگز کھیلی۔ وٹمنی ایک بہترین سری لنکن بلے باز تھے۔ انہوں نے اس کے علاوہ بھی کئی یادگار اننگز کھیلیں۔

زمبابوے...... ڈیو ہاؤٹن:

آج سے تقریباً 22 سال پہلے 1992ء میں ہرارے کے مقام پر زمبابوے نے اپنا پہلا ٹیسٹ میچ بھارت کے خلاف کھیلا۔ ڈیو ہاؤٹن، وہ پہلے بلے باز تھے جنہوں نے اپنے ملک کی طرف سے اس ٹیسٹ میچ میں 116 رنز بنا کر یہ منفرد اعزاز حاصل کیا تھا۔ ڈیو ہاؤٹن کا شمار زمبابوے کے بہترین بلے بازوں میں ہوتا ہے۔

بنگلہ دیش...... انیس الاسلام:

انیس الاسلام وہ پہلے بنگلہ دیشی بلے باز ہیں جنہوں نے اپنے ملک کی طرف سے پہلی ٹیسٹ سنچری اسکور کی۔ انہوں نے نومبر 2000ء میں بھارت کی مضبوط ٹیم کے خلاف ڈھاکہ میں 145 رنز کی شاندار اننگز کھیلی۔ ☆☆☆☆

معلومات عامہ

☆ سندھی زبان کے پہلے ناول کا نام "زینت" ہے۔
☆ بوعلی سینا کی کتاب "القانون" علم طب کے موضوع پر ہے۔
☆ بابائے اردو مولوی عبدالحق 20 اپریل 1870ء میں پیدا ہوئے۔
☆ نثر کے لغوی معنی "پراگندہ" اور "منتشر" کے ہیں۔
☆ بحیرہ ابیض (White Sea) روس میں واقع ہے۔
☆ دریائے ایمزن سب سے چوڑا دریا ہے۔
☆ ڈیرہ غازی خان میں ایک ایسی چارپائی تھی جس میں بیک وقت 150 آدمی بیٹھ سکتے تھے۔
☆ گھڑی ہارون الرشید کے عہد میں بغداد میں ایجاد ہوئی۔
☆ انگریزی زبان کے مشہور شاعر "شیکسپیئر" کا باپ دستانے بناتا اور انہیں فروخت کرتا تھا۔
☆ سر درد کے لیے پسا ہوا نمک سونگھنا فائدہ مند ہے۔
☆ ہمارے قومی ترانہ میں لفظ "پاکستان" صرف ایک بار آیا ہے۔
☆ پاکستان کا سب سے بڑا دریا "دریائے سندھ" ہے۔
☆ مینار پاکستان کی اونچائی 196 فٹ 6 انچ ہے۔
☆ سو تک گنتی میں نو کا ہندسہ 19 مرتبہ آتا ہے۔
☆ دنیا کا سب سے اونچا جانور زرافہ ہے۔
☆ باز تمام پرندوں میں سب سے تیز اڑنے والا پرندہ ہے۔
☆ اللہ تعالیٰ نے جنات کو جمعرات کے دن پیدا کیا۔
☆ سمندر کا پانی تازہ پانی سے عموماً ساڑھے تین گنا زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

(محمد علیم نظامی، لاہور)

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 / جون 2015ء ہے۔

مئی 2015ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- چھوٹا سا میں چوزہ ہوں پر کام کروں گا بڑے بڑے۔ (سیدہ تحریم مختار، لاہور)
- یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے۔ (اشرف تواب، راول پنڈی)
- ناناپاپا ویٹ! کر تو لوں اسٹیس اپ ڈیٹ۔ (عاطف ممتاز، چکوال)
- محوِ حیرت ہوں دُنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ (رانا محمد الیاس، خوشاب)
- حیرانی کی کوئی بات نہیں، جناب! یہ نیو جنریشن ہے۔ (عماد احمد منیر، لاہور)

شیزہ جاوید، گوجرانوالہ (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

عمارہ علی جہ، لاہور (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

سلمان علی، واہ کینٹ (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

عائشہ صدیقہ، لاہور (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

کشف طاہر، لاہور (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: بریرہ فاروق، گوجرانوالہ۔ محمد حسان شاہد، بہاول پور۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ عائشہ ظفر، رحیم یار خان۔ لائبہ عرفان، کراچی۔ آمنہ اقبال، قادہ دیدار سنگھ۔ حنا طاہر، ملتان۔ محمد شیراز، گوجرانوالہ۔ اقرا پرویز، رحیم یار خان۔ مقدس چوہدری، راول پنڈی۔ مائرہ حنیف، بہاول پور۔ امن نیاز، راول پنڈی۔ ایمان فاطمہ، لاہور۔ اسوۂ احسینی، اٹک۔ عائشہ فاطمہ، اسلام آباد۔ صالحہ ظفر، چکوال۔ جویریہ ادریس، سیال کوٹ۔ حاجرہ ڈار، گوجرانوالہ۔ ملائیکہ رؤف، لاہور۔ قدر ڈار، گوجرانوالہ۔ دلیجا فاطمہ، تلہ گنگ۔ کائنات ریاض، مردان۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ محمد اسامہ، خانیوال۔ تحریم انور، راول پنڈی۔ عزیز ڈار، سرگودھا۔ عمران فاروق، کراچی۔ مصباح شفیق، خانیوال۔ مجاہد اسماعیل، جہلم۔ اویس راجا، راول پنڈی۔ سحرش توقیر، پشاور۔ صائمہ کامران، کراچی۔ اقبال جاوید، حیدر آباد۔ غلام علی، گوجرانوالہ۔ عبدالخالق، مردان۔ نعمان شاہد۔ بورے والا۔

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

آخری تاریخ 8 جولائی

آخری تاریخ 8 جون